جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، ادبی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

نگرانِ اعلیٰ :

حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

انوار مدینہ

مدیر اعزازی: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مدیر معاون: حبیب الرحمٰن اشرف

جلد: ۲ : شمارہ: ~~۴،۵~~ ۶،۷

رمضان و شوال ۱۳۹۱ھ — نومبر و دسمبر ۱۹۷۱ء

مرتب: حبیب الرحمٰن اشرف

فاضل جامعہ مدنیہ لاہور

کافی لیٹ ہو جانے کی وجہ سے یہ پرچہ چند صفحات کے اضافہ کے ساتھ دو ماہ کا یکجا شائع کیا جا رہا ہے

پتہ: جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور

اِس شمارے میں

اداریہ :		۲
جمع و تدوین قرآن :	حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی مدظلہٗ	۹
اُولٰئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُون :	حضرت علامہ مولانا سید محمد میاں مدظلہ	۱۹
انوارِ صحابہ :	حضرت مولانا مفتی بشیر احمد پسروری مدظلہٗ	۲۸
شرک اور توحید کی حقیقت :	حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری مدظلہٗ	۳۲
دعاء کی افادیت و اہمیت :	حضرت مولانا محمد اجمل مدظلہٗ	۳۶
روح کیا ہے ؟ :	حضرت علامہ مولانا سید محمد میاں مدظلہٗ	۴۴
حسنت جمیع خصالہ :	حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ	۵۵
طلبۂ علومِ دینیہ سے خطاب	قمر عثمانی	۶۰
اقتصادی اور سیاسی مسائل :	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہٗ	۶۱
گلشنِ جامعہ :	الحاج محمود احمد عارف ہوشیارپوری	۷۰

بدل اشتراک	سالانہ : ۷ روپے	طلبہ کے لیے ۵ روپے	فی پرچہ ۶۵ پیسے

سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا

جہاد اور خدا پر بھروسہ

خدا پر بھروسہ کرنے اور اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دینے کا نام "توکل" ہے اور اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں یہ وعدہ فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔ یعنی جو اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو بس اللہ تعالیٰ ہی اس کے لیے کافی ہے۔

جہاد میں صحابہ کرام نے اللہ کی ذات پر بھروسہ کیا۔ اسی کی محبت کو دل میں جگہ دی اللہ کی ذات ہر جگہ ہے۔ گویا ان کا مطلوب ہر جگہ ان کے ساتھ تھا اس لیے وہ جہاد کرتے کرتے اپنے ملک سے ہزاروں میل دُور نکل گئے اور خدا کی زمین نے ہر جگہ ان کیلئے گنجائش پیدا کر دی وہ ان کی مطیع و مسخر ہوتی چلی گئی۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے تمام کام بنا دیئے۔ فرمان خداوندی ہے: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. کہ اگر تم سچے ایمان والے ہو تو تم ہی سربلند رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مدد ہمیشہ اس قوم کے ساتھ ہوا کرتی ہے جو حق پر ہو اور اس کے نام اور اس کے دین کے لیے سینہ سپر ہو۔ اس کے نتیجہ میں وہ پوری قوم سربلندی حاصل کیا کرتی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس قوم کا کوئی فرد زخمی یا شہید نہیں ہوتا یا کسی کو نقصان ہی نہیں پہنچتا۔ ورنہ جنگ احد میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم نہ آتے اور آپ کا روحانی قوت سے ایک پھونک مارنا ہی کفار کے ختم کر دینے کے لیے کافی ہوتا، مگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تکالیف بھی اٹھائی ہیں۔ عم مکرم سید الشہداء حضرت حمزہ بھی شہید ہوئے ہیں اور بھی ستر صحابۂ کرام نے جام شہادت نوش فرمایا ہے اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت کا پورا انتظام فرمایا ہے۔ ڈبل زرہ پہنی ہے۔ سر مبارک پر خود پہنا ہے۔ صحابہ کرام کو جنگی مشق کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ان کی لڑائی کی مشقیں اور کرتب خود شوق سے دیکھے ہیں اور آپ کے بعد سب صحابہ کرام نے اسی نہج پر زندگی گزاری ہے بلکہ ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین نے بھی اور ہمیشہ نتیجہ کے اعتبار سے مسلمانوں ہی کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ مسلمانوں کا نقصان کفار کے مقابلے میں بہت ہی کم رہا ہے جتنے حضرات جہاد کے لیے باہر نکلے تھے اگر کفار کے برابر ان کا نقصان ہوتا تو سب ہی شہید ہو کر ختم ہو گئے ہوتے، لیکن ان کے

توکل و اعتماد علی اللہ کے مطابق خدا کی نصرت و تائید شامل حال رہی اور وہ پوری دنیا پر چھا گئے۔ انکا نقصان دشمن کے نقصان کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر تھا۔

آپ بھی آج میدان جہاد میں ہیں اور طاقت کا سرچشمہ ارادۂ خداوندی ہے آپ اس پر نظر رکھیں وہ اپنی نصرت کے دروازے کھولدے گا۔ حریف آپ کے مقابلہ میں تھوڑی دیر سے زیادہ نہ ٹھہر سکے گا۔ اسے موت عزیز نہیں وہ شہادت کی فضیلت سے بے خبر ہے۔ اسے دنیاوی زندگی عزیز ہے وہ کبھی جان کی قربانی نہ دے سکے گا۔

اللہ نے شہید کی حیات کی مثال آنکھوں سے دکھادی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے امام تھے اور مدینہ شریف کے رہنے والے تھے۔ جنہیں ساری دنیا جانتی ہے اپنی حدیث کی مشہور کتاب مُوَطّاء میں شہداء احد کے بارے میں لکھا ہے کہ چھتیس سال بعد انہیں قبروں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا گیا تو ان کے جسم سالم تھے۔

یہ باتیں کافر کب جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ صدق اللہ العظیم (پارہ ۱۱۔ رکوع ۳)

بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر قتل کرتے ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ یہ توریت اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے۔ جس کا پورا کرنا اسے ضروری ہے اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔ سو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آنکھ خدا کی راہ میں پہرہ دیتی ہے اسے عذاب نہ ہوگا۔

ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ لڑائی کا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں کبھی یکجا نہ ہونگے۔ یعنی جہاد میں جہاں غبار پڑتا ہے تو اس جگہ جہنم کی آگ اثر نہیں کرتی۔

ایک اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ شہید سے قبر میں سوال نہیں ہوتا۔ صرف قرض کے بارے میں فرمایا گیا ہے

کہ وہ باقی رہتا ہے (اس لیے یا ادا کیا جائے یا معاف کرایا جائے)

مسلمان کا ایمان اس کو بڑے شوق سے جانی قربانی پر آمادہ کر دیتا ہے اور کافر جان دینے سے بھاگتا ہے۔ غرض خلوص نیت کے ساتھ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اگر جہاد کیا جائے تو فرشتے بھی مدد کو آتے ہیں۔ ان کی مدد اس طرح ہوتی ہے کہ لڑنے والے مسلمانوں کے دل میں گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ فرشتوں کی مدد کی وجہ سے غیبی سکون اور اطمینان ہوتا ہے اور مقابل کے دل میں گھبراہٹ آجاتی ہے اس سے کوئی صحیح کام نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ نے بدر کے موقع پر ملائکہ بھیجے تو مسلمانوں کو دلی سکون حاصل ہوا۔ ان کے دل اتنے مطمئن تھے کہ انہیں میدانِ جنگ میں بار بار اونگھ آتی رہی۔ وہاں پانی نہ تھا اللہ نے بارش برسادی اور صحابہ کرام کی طرف بھی تالاب سے بن گئے۔

شریعت مطہرہ میں ظاہری سامان مکمل رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن یہ تعلیم دی گئی ہے کہ سامان پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیئے اور جو سامان مہیا ہی نہ ہو سکے تو اس وقت اللہ پر بھروسہ رکھنے کا ثمرہ ظاہر ہوگا اور پھر بھی آپ ہی کو کامیابی ہوگی۔

حادثۂ عظیمہ

جامع معقول ومنقول حاوی فروع واصول شیخ المحدثین والمفسرین یادگارِ سلف حضرت مولانا رسول خانصاحب نوراللہ مرقدہٗ کی وفات تمام اہلِ علم کی نظر میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

حضرت اقدس کا وطن عزیز ضلع ہزارہ میں موضع اچھڑیاں تھا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور وہیں تدریسی فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔ ہمیشہ معقولات وغیرہ کی مشکل وبلند پایہ کتابیں زیرِ تدریس رہیں۔

آپ نے بارہا اس امر کا اظہار فرمایا کہ میں نے شیخ الہند اسیر مالٹا حضرت مولانا محمود حسن صاحب (خلیفۂ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ اسرارہما) سے بہت کتابیں پڑھی تھیں۔

اس دفعہ جامعہ مدنیہ میں ایک امتحان کے موقعہ پر (۱۱ رجب، ۱۳ ستمبر کو) جب تشریف لائے تو حضرت مولانا کو اسی کمرے میں بٹھایا گیا جس کی بنیاد دو سال پہلے حضرت نے اپنے دستِ مبارک سے دفتر اہتمام کے لیے رکھی تھی۔ جب امتحان سے فارغ ہو کر تشریف فرما ہوئے تو اسوقت پھر اسی قسم کی گفتگو چل نکلی اور حضرت نے اپنے استاذ محترم حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی وجد آفریں انداز میں تعریف شروع کر دی اور فرمایا کہ میں نے توضیح تلویح، بیضاوی اور بہت سی کتابیں حضرت سے پڑھی ہیں۔ ان

کے علاوہ حدیث شریف تو پڑھی ہی تھی۔

حضرت مولاناؒ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انداز تدریس، اختصار، جامعیت اور درس میں برکت کا خاص طور پر بارہا ذکر فرمایا اور بلاشبہ وہ ایسے ہی تھے کہ ان کے بعد ان کی جگہ مسند آرائے درس حدیث ہونے والے انور شاہ وحسین احمد جیسے بلند پایہ اساتذہ عرب وعجم و نابغۂ روزگار آسمان علم کے آفتاب اُن ہی کے شاگرد تھے جنہوں نے اُن سے خوب خوب فیض حاصل کیا اور آج پاک و ہند میں ہر مدرسہ میں ان ہی کے شاگرد روح رواں بنے ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی کہ جن کی نظیر فتاویٰ کے باب میں نہ انکے دور میں تھی نہ اب تک ہوئی حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے، حضرت مولانا رسول خاں صاحب ان حضرات سے تو متأخر تھے، مگر شاگرد حضرت شیخ الہند ہی کے تھے اور یہی وہ شرف تھا جس سے مولانا رسول خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باکمال شخصیت کو چار چاند لگے۔

جیسے کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ حضرت مولانا رسول خاں صاحب نے فارغ ہونے کے بعد دیوبند ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس دَور میں ان سے علم حاصل کرنے والوں میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا عبدالحق صاحب مرحوم اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب وغیرہم جیسے علماء کبار بھی تھے۔ جو آج خود معمر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور یہ سب ہی دارالعلوم دیوبند کے مدرس بھی رہے۔

حضرت مولانا رسول خانصاحب کچھ عرصہ بعد لاہور اورینٹیل کالج میں تشریف لے آئے، لیکن چونکہ آپ کے شاگرد دارالعلوم میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس لیے اس زمانہ میں علم حاصل کرنے والے طلبہ آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہو گئے اور آپ کے وہاں موجود نہ رہنے کے باوجود دارالعلوم میں آپکا نام روشن رہا۔

آپ کے ہم پلہ اور ہمعمر ساتھیوں میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مرحوم ومغفور (صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) تھے۔ حضرت مولانا ابراہیم کو فلسفہ میں بلند مقام حاصل تھا اور حضرت مولانا رسول خانصاحب کا منطق میں اعلیٰ مقام شمار ہوتا تھا۔ حضرت علامہ بلیاوی بجز چند سال کے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور اب سے چار سال پیشتر رمضان المبارک میں بعمر ۹۵ سال دیوبند ہی میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالےٰ۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا رسول خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بھی سو سال کے لگ بھگ تھی۔ مجھے دارالعلوم دیوبند میں موجود بعض اکابر سے حضرت کی عمر کے بارے سوال کا اتفاق ہوا اور خود حضرت مولانا رسول خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

بھی دریافت کیا تو دونوں ہی حضرات کی باتیں ملتی جلتی پائیں۔

اب اس زمانہ میں چند ہی ہستیاں ایسی ہوں گی جنہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ یا زیادہ فیض حاصل کیا ہو۔ ان میں سے ایک حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہم کی ذات گرامی ہے جو اپنے وطن سخی کوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں رونق افروز ہیں وہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کی طرح مالٹا میں بھی پانچ سال قید رہے اور اکتساب فیض کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے وجود مسعود کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر قائم رکھے۔ آمین

کچھ حدیث شریف کا فیض حاصل کرنے والوں میں حضرت مولانا شریف اللہ خاں صاحب مدظلہم بھی ہیں جو فتحپوری دہلی میں عرصہ تک صدر مدرس رہے ہیں اور آجکل جامعہ مدنیہ میں مدرس حدیث ہیں۔ مد اللہ ظلہٗ۔ ان دو حضرات کے علاوہ میرے علم میں تیسری ایسی شخصیت نہیں ہے جسنے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کیا ہو۔

حضرت مولانا رسول خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ علمی اعتبار سے اسقدر بلند پایہ اور صحیح معنے میں شیخ المحدثین والمفسرین تھے، لیکن درخت ثمردار کی طرح حقیقی تواضع کے وصف عالی سے بھی متصف تھے۔ اپنے قدیم شاگردوں کے ساتھ اس درجہ تواضع و انکساری سے پیش آتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ قدیم شاگردوں کے بارے میں تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ خود بھی بڑھاپے کو پہنچ گئے اور پرانے استاد ہو گئے ہیں، مگر مولانا تو نئے نئے شاگردوں سے بھی اسی قدر تواضع و انکساری سے پیش آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی آپ پر تواضع کا غلبہ ہوتا گیا اور جسقدر تواضع غالب ہوئی اسی قدر مزید بلندیاں بارگاہ الٰہی سے عنایت ہوئیں سچ ہے۔ من تواضع للہ رفعہ اللہ۔

آخر میں ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۵۵ء سے آپ جامعہ اشرفیہ سے منسلک ہو گئے۔ پہلے معقولات کی کتابیں قاضی وغیرہ پڑھاتے رہے۔ بعد میں ترمذی شریف آخر تک زیر درس رہی۔ آپ کو بیعت و اجازت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ العزیز سے حاصل تھی۔ صرف تین دن کی علالت رہی۔ نمونیہ کا حملہ ہوا۔ پہلے دن آپ نے کھڑے ہو کر ہی نمازیں ادا فرمائیں۔ دوسرے اور تیسرے دن غفلت کی کیفیت رہی، مگر نماز کے وقت نماز کا پورا ہوش آجاتا تھا اور بیٹھ کر نماز ادا فرماتے تھے، کوئی بھی نماز قضا نہیں ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور آپ کی کرامت تھی۔ وفات کے وقت پھر ہوش آیا۔ سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کی اور اپنے ایک عزیز سے فرمایا کہ تم بھی سورۂ یٰسین پڑھو تمہارے ساتھ میں بھی پڑھتا رہوں گا تاکہ کہیں غلطی یا بھول نہ ہو اسی طرح تلاوت سماعت فرماتے تھے کہ وفات ہو گئی۔ تغمدہ اللہ وایانا برحمتہ ورضوانہ آمین

آپ کی وفات پر ہر عالم کو ایسا صدمہ ہے کہ سب ہی ایک دوسرے سے تعزیت کے مستحق ہیں اور آپ کا وجود مسعود سب ہی کے لیے ایک رحمت تھا۔ آپکی وفات بروز یکشنبہ ۳ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ، ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور جملہ پسماندگان اہل خانہ کو صبر جمیل اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حامد میاں

جامعہ مدنیہ

شیخ المحدثین والمفسرین حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب خلیفہ حضرت تھانوی قدس سرہما

کی نظر میں

الحمدللہ کہ جامعہ مدنیہ دین کی بہت بڑی خدمت کر رہا ہے۔ یہاں پر فنون کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے احقر نے کئی دفعہ بخاری شریف، قاضی مبارک، خیالی صدرا اور دوسری بڑی بڑی فنی کتابوں کا امتحان لیا۔ الحمدللہ طلبہ بہت قابل اور محنتی ہیں۔ بہت سے طلبہ نے امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کیے۔ طلبہ کی قابلیت سے ان کے اساتذہ کی قابلیت انّی دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔

مَیں السید المحترم حضرت مولانا حامد میاں صاحب مدظلہ العالی مہتمم مدرسہ کو اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کا مدرسہ فنون کی تعلیم میں بے نظیر ہے اور مدرسین لائق فائق ہیں۔ حق تعالیٰ مدرسہ کے معاونین کو دارین کی ترقی سے نوازیں۔ دینی علوم کے اس مرکز کو تادیر قائم فرمائیں۔

محمد رسول خان عفا اللہ عنہ

جمع و تدوین قرآن

شیخ التفسیر حضرۃ علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم

قرآن چونکہ خالق کائنات کی آخری کتاب ہے، اس لیے اللہ تعالےٰ نے اس کی محفوظیت کا مکمل انتظام فرمایا۔ عالم بالا میں تو اس کو لوحِ محفوظ اور بیت العزت میں محفوظ کیا اور زمین پر اس کی حفاظت کے دو انتظامات کیے گئے۔ حفاظتِ صدری یعنی نبیٔ کریم علیہ السلام اور اُمّت کے قلب و دماغ میں اس کو محفوظ کرنا، جس کو قرآن نے خود ذکر کیا ہے۔ بخاری میں ابنِ عباس سے منقول ہے کہ نزول قرآن کے وقت جبرائیل علیہ السلام کے پڑھنے اور تلاوت کرنے کے ساتھ ساتھ حضورؐ بھی پڑھتے جاتے تھے تاکہ وحی قرآنی محفوظ رہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔
(سورہ القیامۃ آیۃ ۱۶-۱۷)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا تیرے سینے میں اور پڑھنا تیری زبان سے۔

اس کے بعد آپ خاموش ہو کر سنتے تھے اور اسی طرح یاد ہو کر دوسروں کو پہنچا دیتے تھے۔ اسی طرح قرآن کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو، پھر تو نہ بھولے گا اس میں حفظِ قرآن کا وعدہ کیا گیا اسی طرح اُمّت کے سینوں میں قرآن کی حفاظت کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيَاتٌۢ بَيِّنَاتٌ فِيْ صُدُوْرِ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔

قرآن کی کھلی آیتیں ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں موجود ہیں۔

صدری حفاظت کا انتظام

چونکہ قدرتِ الٰہی نے اس آخری کتاب کی صدری حفاظت کا سامان فرمانا تھا۔ اس لیے نزول قرآن کے لیے اوّلاً ایسی قوم کو منتخب فرمایا جو تمام اقوام سے اپنی قوتِ حافظہ میں لاجواب تھی۔ ان کے سینے قومی واقعات

اور قبائلی انساب کے خزانے تھے اور جو ایک بار سینکڑوں اشعار کا قصیدہ سُن لیتے تھے تو پُورا قصیدہ دل و دماغ پر نقش ہو کر یاد ہو جاتا تھا۔ جس پر عرب کی تاریخ شاہد ہے، پھر چونکہ وہ امّی قوم تھی تو اُن کی ہر شنید کے باقی رکھنے کا مدار صرف حافظے پر تھا۔ ان کی اس جبلّی اور فطری قوتِ حافظہ کو اسلام اور قرآن نے اور جلا بخشی اور اس میں کافی اضافہ ہُوا۔ اس کے علاوہ عرب کے لیے قرآن کو محفوظ رکھنے، ان کی دلچسپی اور شوق بڑھانے کے لیے دیگر اسباب اور محرکات بھی جمع ہوئے جس نے ان کی پوری قوتِ حافظہ کو اور ذہن و دماغ کو حفظِ قرآن کی طرف بیش از بیش متوجہ کر دیا جو حسب ذیل ہیں۔

محرّک اوّل | عرب کی زندگی سادہ تھی، پُر تکلّف نہ تھی۔ اس لیے ان کی ضروریاتِ معاش بہت مختصر تھے جن کے لیے مزید کد و کاوش اور جد و جہد کی ضرورت نہ تھی۔ جو کچھ موجود تھا اس پر قناعت کرتے اور اس سے زیادہ کی طلب ان کو نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگی فارغ تھی اور حفظِ قرآن کے لیے ان کو کافی فراغت و فرصت حاصل تھی جس میں وہ وقت کا اکثر حصّہ صرف کر سکتے تھے، اور وقت بھی حفظ کے لیے ایک ضروری سبب اور محرک ہے۔

محرّکِ دوم | قرآن اور وحی الٰہی کے ساتھ اُن کو فوق العادت محبت تھی اور عشق تھا اور محبّت ایک چیز کے جذب کرنے اور حاصل کرنے کا سب سے بڑا محرّک ہے۔ جو ان کو حفظِ قرآن پر عاشقانہ انداز میں آمادہ کرتا تھا۔ صحابۂ کرام کی محبتِ قرآن سے تاریخی واقعات پُر ہیں، جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جب ایک چیز کے یاد کرنے کے ساتھ ایک قوی الحافظہ قوم کو عاشقانہ محبت قائم ہو جاتی ہے تو وہ اس چیز کو جلد حفظ کر لیتی ہے۔

محرّک سوم | تیسرا محرک قرآن کا تعجب انگیز اور حیرت افزا معجزانہ رنگ تھا۔ بالخصوص جبکہ تمام فصحاء اور بلغاء اس کی مثل لانے سے عاجز آ گئے تھے۔ اسی معجزانہ رنگ نے بھی صحابہ رضؓ کے دلوں کو حفظِ قرآن کی طرف کھینچا۔ کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر عجیب و غریب اور بے مثال چیز کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اس محرک نے بھی صحابۂ کرام رضؓ کے قلوب کو حفظِ قرآن کی طرف جھکایا اور وہ ہمہ تن اس کے یاد کرنے میں مصروف ہُوئے اور قرآن کے حیرت انگیز اعجاز نے ان میں حفظِ قرآن کے لیے شدید جذبہ اور زبردست تڑپ پیدا کی۔

محرک چہارم | حدیث میں علم و عمل و حفظِ قرآن کی ترغیب دی گئی ہے جس پر صحابہ کرام کا ایمان اور یقین کامل تھا۔ اس درجہ کا یقین کہ قرآن و حدیث کے احکام پر عمل کرنے کے لیے وہ جان تک قربان کر سکتے تھے اور اس کو بڑی کامیابی سمجھتے تھے تو جب صحابۂ کرام الٰہی ترغیب کی آیات مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ۔ اسی طرح کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

کو سُن لیتے تو یقیناً ان میں آتش شوق بھڑک اُٹھتی تھی۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ بروایت عثمان رضی اللہ عنہ:

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ — تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

اور ترمذی کی حدیث ہے بروایت ابنِ مسعود مَنْ قَرَءَ حَرْفًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَلَہٗ بِہٖ حَسَنَۃٌ وَالْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا لَآ اَقُوْلُ الٓمٓ حَرْفٌ بَلْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَّ لَامٌ حَرْفٌ وَّمِیْمٌ حَرْفٌ۔

جس میں قرآنی الفاظ کے ایک ایک حرف پر دس نیکیوں کے اجر و ثواب مِل جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس ترغیب سے صحابہ کے شوق پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ ایسی بہت سی آیات و احادیث دربارہ علم و عمل و حفظِ قرآن موجود ہیں۔ جن کی ترغیبات صحابۂ کرام کے لیے حفظِ قرآن کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہوئیں اور انہوں نے حفظِ قرآن میں پوری زندگی لگا دی۔

محرک پنجم | قرآنِ حکیم صحابۂ کرام کے لیے دین و دنیا کی نجات کا واحد ذریعہ تھا اور اپنی دین و دنیا کی کل کامیابیوں کو قرآن سے وابستہ سمجھتے تھے تو جس چیز کو وہ اپنے دین و دنیا کے فوائد کا سرچشمہ اور مرکز جانتے تھے۔ ان کے لیے یہ تصوّر ان کو حفظِ قرآن پر آمادگی کا بہت بڑا محرک ہوتا تھا۔ جو اُن کے دلوں میں حفظِ قرآن کا عشق پیدا کرتا تھا۔

محرکِ ششم | قرآنِ حکیم کو وہ نماز میں پڑھتے تھے، تراویح میں سُناتے تھے۔ زندگی کے معاملات میں اس کے مطابق

---

[1] سورہ فاطر آیۃ: ۲۹ [2] سورہ ص آیۃ: ۲۹

فیصلہ کرتے تھے۔ عقائد، عبادات، اخلاق و اعمال میں اُس کی ہدایت پر چلتے تھے۔ اس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں قرآن کا حفظ عزت و شرف کا ذریعہ تھا۔ یہ تمام اُمورِ حاجی و شرفی اس امر کے محرک بنے کہ وہ حفظِ قرآن کا پُورا اہتمام رکھیں۔

حفظِ قرآن اور صحابۂ کرام رضؓ

ان گذشتہ محرکات کا اثر تھا کہ صحابۂ کرام رضؓ نے حفظِ قرآن کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ قبائل عرب دُور دراز سے مسافت طے کر کے حفظِ قرآن کے لیے مدینہ پہنچتے تھے اور قرآن حفظ کرتے تھے اور خود حضور علیہ السّلام حفّاظ و قراء قرآن کی جماعتیں قبائل میں بھیجا کرتے تھے کہ ان کو قرآن حفظ کرا دیں۔ صفر ۴ھ میں ابو براء کی درخواست پر اہلِ نجد کی تعلیمِ قرآن اور تبلیغ کے لیے آپ نے منذر بن رضؓ عمرو ساعدی بن اُمیّہ کی امارت میں ستر قاریوں کو روانہ کیا جو عامر بن طفیل کی غداری سے بجز دو حضرات منذر بن محمد رضؓ اور عمرو رضؓ بن اُمیّہ کے سب کے سب شہید کر دیئے گئے۔ حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ نے بوقت قتل۔ جب نیزہ ان کے پار ہوا۔ یہ کہا:

اَللّٰہُ اکبر فزت و رب الکعبہ — اللہ اکبر۔ کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہُوا

اسی جماعۃ کا نام سریۃ القراء تھا۔ اس سے حفاظ و قراء قرآن کی کثرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[1]

علامہ ذہبی نے طبقات القراء میں مشہور سات قراء و حفاظ کا نام لیا ہے جن تک قراء کی سند قرأت پہنچتی ہے وہ یہ ہیں: ۱۔ عثمان رضؓ بن عفان۔ ۲۔ علی رضؓ ابن ابی طالب ۳۔ ابی رضؓ بن کعب ۴۔ عبداللہ رضؓ بن مسعود ۵۔ سالم رضؓ مولیٰ۔ ۶۔ ابی حذیفہ رضؓ ۷۔ معاذ بن جبل رضؓ۔ جن میں ابی بن کعب رضؓ سید القراء ہیں۔ مفتاح السعادات جلد اوّل میں ہے کہ ابُو موسیٰ الاشعری رضؓ نے پورا قرآن حفظ کیا تھا اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سنایا۔ صحابہ کرام میں دس ہزار حافظ صحابہ زیادہ مشہور تھے۔ جن میں ۲۷ کو اعلیٰ مقام حاصل تھا، جن کے اسماء یہ ہیں: ۱۔ ابوبکر صدیق ۲۔ عمر فاروق ۳۔ عثمان بن عفان ۴۔ علی ابن ابی طالب ۵۔ عبداللہ بن مسعود۔ ۶ طلحہ ۷ سعد بن ابی وقاص ۸ حذیفہ بن الیمان ۹۔ ابوہریرۃ ۱۰ عبادۃ بن الصامت ۱۱۔ معاذ بن جبل ۱۲۔ مجمع بن حارثہ ۱۳ فضالہ بن عبید ۱۴ ابُو موسیٰ

---

[1] فتح الباری جلد: ۷ صفحہ: ۲۹۶۔ زرقانی جلد: ۲ صفحہ: ۴۷

اشعری ۱۵۔عمرو بن عاص ۱۶ سعد بن عبادہ ۱۷ عبداللہ بن عباس ۱۸ ابوایوب انصاری ۱۹۔عبد بن ذوالحارین ۲۰۔ عبید بن معاویہ زید بن ثابت ۲۱ ابوزید ۲۲۔سالم مولی ابی حذیفہ۔ ۲۳۔سلمہ بن مخلد بن الصامت ۲۴۔سعد بن عبید بن نعمان انصاری ۲۵۔زید بن ثابت ۲۶ ابی بن کعب ۲۷ عبداللہ بن السائب ۲۸ سلیمان بن ابی عشمۃ ۲۹۔تمیم الداری ۳۰۔معاذ بن الحارث ۳۱۔ابوالدرداء۔ ۳۲۔عقبۃ بن عامر الجہنی ۳۳۔عبداللہ بن عمر بن خطاب ۳۴۔سعد بن المنذر بن اوس ۳۵۔قیس بن صعقہ ۳۶۔عبداللہ بن عمرو بن عاص ۳۷۔ابوحلیمہ معاذ۔ یہ تو پورے قرآن کے حفاظ کا مختصر بیان ہے اور جن کو جزوی طور پر قرآن حفظ تھا۔ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ حفاظِ قرآن کا دورِ اول تھا، جوں جوں اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔تعدادِ حفاظ قرآن بھی بڑھتی گئی۔سر ولیم میور جیسے دشمنِ اسلام کو بھی لائف آف محمدؐ میں اعتراف کرنا پڑا کہ صحابہ کرام بے مثال حافظہ رکھتے تھے۔چنانچہ لکھتا ہے "قوتِ حافظہ ان کی انتہائی درجہ پر تھی اور اس کو وہ لوگ قرآن کی نسبت سرگرمی سے کام میں لاتے تھے۔ان کا حافظہ ایسا مضبوط تھا اور ان کی محبت ایسی قوی تھی کہ اکثر صحابہ پیغمبر کی حیات میں بڑی صحت کے ساتھ وحی کو حفظ پڑھ سکتے تھے (لائف آف محمدؐ) چھٹی صدی عیسوی میں عرب کیا ساری دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فی ہزار سے بھی کم تھی۔پریس اور مطابع کا انتظام نہ تھا۔اس لیے زیادہ تر انحصارِ حفاظت یاد کرنے پر ہوتا تھا۔ ورنہ چند تحریرات میں ردوبدل کا احتمال ممکن تھا۔یہی وجہ ہوئی کہ مذاہبِ عالم کی تحریری کتابوں میں تحریف ہوئی۔قرآنِ حکیم عہدِ رسالت میں ہزاروں سینوں میں مکمل محفوظ تھا اور لاکھوں سینوں میں متفرق طور پر محفوظ تھا۔اسی کو قرآن نے سورہ عنکبوت میں بیان کیا ہے:

بَلْ هُوَ اٰيَاتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (عنکبوت آیۃ: ۴۹)

یعنی قرآن کھلی ہوئی آیتوں کا مجموعہ ہے جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

حفظ و تلاوتِ قرآن کا سلسلہ تمام مسلمانوں میں جاری تھا۔نماز میں قرآن پڑھنا فرض تھا اور تمام مسلمان نماز میں قرآن پڑھتے تھے۔یہاں تک کہ عثمان غنی اور تمیم داری ایک رکعت میں قرآن ختم کرتے تھے[2] عبداللہ بن

---

[1] تہذیب التہذیب: طبقات بن سعد، تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔مفتاح السعادت، اتقان، صحیح البخاری۔

[2] تہذیب التہذیب و استیعاب۔

بن عمر اور عبداللہ بن عمرو العاص ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے[1] سعد بن المنذر تین دن میں قرآن ختم کرتے تھے۔[2] سلف کی تلاوتِ قرآن کا یہ حال تھا کہ بعض دن رات میں آٹھ بار قرآنِ کریم ختم کرتے تھے۔ چار دن اور چار رات میں۔ بعض دن میں تین بار قرآن ختم کرتے۔ بعض دو بار، یہاں تک کہ حضور علیہ السلام نے تین دن سے کم مدت میں ختم کرنے کی ممانعت فرمائی، تاکہ فہم مطالب قرآن میں خلل واقع نہ ہو۔ ترمذی میں عبداللہ بن عمر نے مرفوعاً روایت کی ہے لَا یَفْقَهُ مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ[3] ۔ سینوں میں حفاظت کا یہ انتظام کسی انسانی یا آسمانی کتاب کو نصیب نہیں ہوا جو کتاب مسلمانوں کے گوشت و پوست اور دل و دماغ میں پیوست ہو چکی ہو اور مشرق و مغرب میں ہر دور میں اس کے لاکھوں حفاظ موجود ہوں اور پھر سب کے محفوظ اور یکساں ہوں، ایک حرف کی کمی بیشی نہ ہو، اس بے نظیر انتظام حفاظ کے باوجود کیا قرآن کی حفاظت میں کسی شک و تردد کا احتمال باقی رہ سکتا ہے؟

قرآنِ حکیم کی تحریری حفاظت

اتقان میں مستدرک حاکم کے حوالے سے منقول ہے کہ قرآن تحریری صورت میں تین بار جمع ہوا۔

۱۔ عہدِ نبوی میں ۲ عہدِ صدیقی میں ۳ عہدِ عثمانی میں۔

جمع نبوی و صدیقی، بخاری وغیرہ میں زید بن ثابت انصاری کی روایت ہے۔[4] اور جمع عثمانی حضرت حذیفہ بن الیمانی کی روایت سے منقول ہے۔ ان تینوں جمع کی نوعیت میں فرق تھا۔ جمع نبوی کا مقصد قرآن کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس لیے قرآن کو مختلف اشیاء پر تحریر کیا گیا۔ کچھ سفید پتھروں کی تراشی ہوئی تختیوں پر، کچھ سفید چمڑوں اور کچھ لکڑی کی ہموار تختیوں پر۔ اس لیے یہ جمع یکجائی شکل میں نہ تھی۔ عہدِ صدیقی میں جمع قرآن سے یہ مقصود تھا کہ قرآن کو یکجا کتابی صورت میں جمع کیا جائے تاکہ متفرق قطعات میں سے کسی قطع کے ضائع ہونے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ یہ جمع کاغذ پر ہوا جو عہدِ نبوی میں نہ تھا اور عہدِ صدیقی میں شام سے مدینہ منورہ میں پہنچ چکا تھا۔ موطا مالک میں سالم بن عبداللہ سے روایت ہے۔

جَمَعَ اَبُوْبَكْرٍ الْقُرْاٰنَ فِی الْقَرَاطِیْسِ — ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو کاغذ پر لکھ کر جمع کیا۔

---

[1] فتح الباری [2] اسد الغابۃ [3] اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۰۴ [4] اتقان جلد ۱ ص ۵۷ تا ۵۹

مغازی موسیٰ بن عقبہ میں ہے :

حَتّٰی جُمِعَ عَلٰی عَهْدِ اَبِیْ بَکْرٍ فِی الْوَرَقِ

(اتقان جلد ۱ صـ۵۹)

یعنی ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانے میں قرآن کاغذ پر لکھ کر جمع کیا گیا۔

عہدِ عثمان میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو اختلافِ تلفّظ سے محفوظ رکھنا تھا تاکہ اختلافِ قرأت اور اختلافِ طرزِ تلفظ سے فتنہ پیدا نہ ہو۔ یہی فرق امام سیوطی رحؒ نے اتقان میں ابنِ تین سے نقل کیا ہے

(اتقان جلد ا صـ۶۰)

جمع صدّیقی رضؓ

اس جمع کے محرک فاروقِ اعظم رضؓ تھے۔ بخاری میں زید بن ثابت سے روایت ہے کہ جب جنگِ یمامہ میں ستّر حفاظ اور قرّاء قرآن شہید ہو چکے تو ابوبکر صدیق نے مجھے بلایا۔ جب میں گیا تو حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کے پاس حضرت عمر رضؓ موجود تھے۔ حضرت صدّیق رضؓ نے فرمایا :-

اِنَّ عُمَرَ اَتَانِیْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ فِی الْمَوَاطِنِ فَیَذْهَبَ کَثِیْرٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ فَقُلْتُ کَیْفَ تَفْعَلُ شَیْئًا لَّمْ یَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللّٰهِ خَیْرٌ فَلَمْ یَزَلْ یُرَاجِعُنِیْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِذٰلِكَ ۔

یعنی عمر رضؓ میرے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کی جنگ کی تیزی میں قراءِ قرآن شہید ہو گئے اگر اور جنگوں میں بھی شہادت قراء کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تو قرآن کے اکثر حصوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا آپ حکم دیں کہ قرآن کو تحریری صورت میں جمع کیا جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہم ایسا کام کیوں کریں جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہیں کیا۔ عمر نے کہا قسم خدا کی کہ اسی میں خیر ہے۔ آپ کا یہ مطالبہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا ۔

پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن عہدِ نبوی ؐ میں تحریری صورت میں خود حضور علیہ السلام نے لکھوایا تھا۔ لیکن ایک کتابی، اجتماعی شکل میں نہیں تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطالبہ اجتماعی اور کتابی صورت میں جمع کرنے کا تھا۔ اس لیے حضرت صدیق ؓ نے فرمایا کہ ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس سے مراد مجموعی کتابی صورت کی تدوین تھی۔ جس کی عہدِ نبوت میں ضرورت نہ تھی۔ لیکن عہدِ صدیقی میں ایسے احوال اور حادثات پیش آئے کہ ایسا کرنا ضروری ہوا اور حضرت صدیق ؓ پر مصلحت کھل گئی، اس لیے انہوں نے حضرت عمر ؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ عہدِ نبوی میں قرآن کو مجموعہ کتابی صورت میں مدون نہ کرنے کے اسباب حسبِ ذیل تھے۔

۱۔ عہدِ نبوی میں وہ اسباب پیدا نہیں ہوئے تھے جو عہدِ صدیق میں پیدا ہوئے اور جس کی وجہ سے کتابی شکل میں قرآن کا قلمبند کیا جانا ضروری ٹھہرا۔

۲۔ عہدِ نبوی میں تحریر کی وہ سہولتیں فراہم نہیں تھیں جو عہدِ صدیقی میں فراہم ہوئیں۔ مثلاً کاغذ و دیگر ادوات کتابت۔

۳۔ عہدِ نبوی ؐ میں نسخ تلاوت کا احتمال تھا۔ جس کی وجہ سے کتابی صورت میں تغیر کرنا پڑتا، جو موزوں نہ تھا۔

۴۔ قرآن کی ترتیبِ نزولی احوال و واقعات کے مطابق تھی اور آیات و سور کی ترتیب ربطِ مضامین کے اعتبار سے تھی اگر عہدِ نبوت میں قرآن کتابی صورت میں مرتب کیا جاتا تو جدید نازل شدہ آیات کو ان کے مناسب آیات و سور کے ساتھ ملا دینے میں دشواری ہوتی۔ ان وجوہات کی بناء پر عہدِ نبوت میں قرآن کو کتابی صورت میں جمع نہیں کیا گیا، لیکن عہدِ صدیقی میں حالات بالکل بدل گئے، قراء کی شہادت نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کرنے کی ضرورت پیدا کی۔ کاغذ اور ادوات کتابت کی سہولتیں مہیا ہوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وحی منقطع ہوئی اور قرآن کا نزول مکمل ہوا۔ لہٰذا قرآن کو کتابی صورت دینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔

دستورِ جمع صدیقی

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع قرآن میں پوری احتیاط برتی اور ایسے انتظام کیے کہ قرآن کے جمع کتابی میں کسی قسم کے سہو اور فروگذاشت کا احتمال باقی نہیں ہے۔ آپ نے جمع قرآن میں صرف محفوظ یا مکتوب یا مسموع ہونے پر اکتفاء نہیں کیا کہ ان آیات کو قلمبند کیا جائے جو کسی کو حفظ ہوں یا کسی چیز پر تحریر ہوئی ہوں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے سُنی گئی ہوں بلکہ جمع قرآن میں دو قاعدوں پر عمل کیا گیا۔

۱۔ ان لکھی ہوئی آیات کو جمع کیا جائے گا جو رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سامنے لکھوائی ہوں، اور دو عادل گواہوں کے ذریعے اسی طرح لکھوانے کا ثبوت مُہیا ہو جائے۔ ابو داؤد میں عروہ سے

ان ابا بکرٍ قال لعُمَرَ وَزَیدٍ اُقعُدا علی بابِ المسجد فمن جاءَ کما بشاھدین علیٰ شیٍٔ مِن کتابِ اللہ فا کتباہ۔

۲۔ دوم یہ کہ وہ آیاتِ مکتوب ہونے کے علاوہ کثیر التعداد صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ بھی ہوں۔ (مناہل العرفان جلد اصفحہ ۲۴۵)

اسی طرح ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَمَا کانُوا یَکتُبُونَ فِی الصُّحُفِ	یعنی صحابہ قرآن کو لکھتے تھے، صحیفوں،
وَالاَلواحِ وَالعُصُبِ وَکَانَ لَا یُقبَلُ	تختیوں اور شاخہائے خرما پر لیکن اس کو دو گواہوں
مِن اَحَدٍ حَتّٰی یَشہَدَ شَاھِدَانِ۔	کی گواہی کے بعد قبول کیا جاتا تھا۔

جمع عُثمانی

اسلام کا دائرہ جب وسیع ہو گیا تو جن مُسلمانوں نے قرآنی آیات کو جس اُستاد سے جس طرز تلفظ اور قراءت سے سیکھا تھا۔ ان میں اور دیگر مسلمانوں میں جن کو دوسری قراءت کی تعلیم دی گئی تھی اختلاف پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ بخاری میں حذیفہ بن الیمان صحابی کا جو فتح آرمینیہ و آذربائیجان سے واپس حضرت عثمان کی خدمت میں پہنچے تھے۔ یہ قول مذکور ہے جو اختلافِ قراءت کے فتنے پر دال ہے کہ آپ نے حضرت عثمان رضؓ سے کہا۔

اَدرِک ھٰذِہِ الاُمَّۃَ قَبلَ اَن تَختَلِفُوا	اس اُمّت کو سنبھالو اس سے پہلے کہ ان میں
اِختِلَافَ الیَھُودِ وَالنَّصٰرٰی۔	یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف پیدا ہو۔

یہاں تک کہ خود مدینہ میں معلّموں اور متعلموں میں اختلافِ قراءت کا فتنہ پیدا ہونے لگا۔ حضرت عثمان رضؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ جب تم میں یہ اختلاف ہے تو دور کے شہر والوں میں اس سے زیادہ اختلاف کا اندیشہ ہے فرمایا:-

انتم عندی تختلفون فمن نأی من الامصار اشدّ اختلافا۔ (مناہل العرفان ج ۱ ۔ ۲۴۹ ۔ اتقان ۵۹)

تو آپ نے یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کے آگے پیش کیا۔ صحابہ کے اجماع پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ سے قرآن کا وہ نسخہ منگوایا جو عہدِ صدیق میں لکھا گیا تھا اور اس کے متعدد نقول لیے گئے تاکہ مشہور شہروں میں ان کو بھیج دیں اور اسی کے مطابق قرآن کی تعلیم و تعلّم جاری ہو اور اس کے علاوہ دوسری قراءتوں کی بندش کر دی گئی اور اسی لیے اس مجموعہ عثمانی کا نام امام رکھا گیا کہ وہ تمام نسخہائے قرآن کے لیے پیشوا ہے۔ اجماعِ صحابہ نے اس مصحف عثمانی کی تحریر کو جس مجلس کے حوالے کیا۔ اس کے چار ارکان تھے۔ تین قریش تھے اور ایک انصاری۔ قریشی حضرات عبداللہ بن زبیر، سعد بن العاص، عبدالرحمٰن بن الحارث تھے اور زید بن ثابت انصاری تھے۔

دستورِ جمع عثمانی

جمع عثمانی میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا۔

۱۔ مصحف میں وہ چیز درج ہو جس کے قرآن ہونے کا قطعی یقین ہو

۲ جو معلوم ہو کہ حضور علیہ السلام کے آخری دورِ تلاوت میں وہ باقی تھا۔

۳۔ جس کی صحت حضور علیہ السلام سے ثابت ہو اور منسوخ التلاوت نہ ہو۔[1]

امام سیوطی نے ان نسخوں کی تعداد سات تک نقل کی ہے جو سات شہروں سے متعلق ہیں۔ ایک نسخہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ میں رکھا اور مکہ، مدینہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ کو ایک ایک نسخہ بھیجا۔[2] پھر ان نسخوں سے بیشمار نسخے مسلمانوں نے نقل کیے اور حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ تمام دیگر نسخوں کو جن میں قراءت کا اختلاف موجود ہو، ان کو تلف کیا جائے۔ حارث محاسبی سے اتقان میں منقول ہے کہ مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمان جامع القرآن ہیں، لیکن جامع القرآن فی الحقیقت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ حضرت عثمان نے لوگوں کو صرف ایک قسم کے طرزِ تلفظ یعنی قراءت پر جمع کیا۔ اس کے قبل کے نسخوں میں متعدد قراءت موجود تھیں جن کے اصل مضمون میں فرق نہیں پڑتا، لیکن طرزِ تلفظ کا اختلاف موجود تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں امیر ہوتا تو بھی وہی کرتا جو حضرت عثمانؓ نے کیا (اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۰)

---

[1] مناہل العرفان جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ [2] اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۰

فتنوں کی سرکوبی قسط: ١١

اولٰئک ھم الرّاشدون

"خلافت و ملوکیت" کے جواب میں!

شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ

نیا جال لائے پرانے شکاری

سبائیوں کا دوسرا اقدام

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر نے سازش کے تمام تار بکھیر دیئے۔ جو بیج لوگوں کے دلوں میں بوئے تھے ان کی جڑیں اکھڑ گئیں تو اب لامحالہ نئے نعروں کی ضرورت ہوئی یہ عجیب اتفاق تھا کہ والیانِ مملکت (گورنر صاحبان) کا جو اجتماع ہوا تھا اُس میں سب وہ تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خاندانی رشتہ بھی رکھتے تھے۔ پھر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو اگرچہ کوفہ سے واپس کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر ہو چکا تھا۔ مگر حضرت معاویہ (والی شام) حضرت عبداللہ بن عامر والی کوفہ اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، والی مصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔ اب یہی برسرِ اقتدار تھے تو ان کو پراپیگنڈے کے لیے اس سے بہتر مواد کیا مل سکتا تھا۔ اب تک پراپیگنڈہ یہ تھا کہ رشتہ داروں کو بے جا عطیات دیتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا مسکت جواب دیدیا تو اب پروپیگنڈہ یہ شروع کیا کہ تمام صوبوں میں اپنے رشتہ داروں کو بھر رکھا ہے اور سارا اختیار و اقتدار اپنے خاندان والوں ہی کے حوالے کر دیا ہے۔ لہٰذا مملکت اسلامیہ کی مصلحت یہ ہے کہ ان رشتہ داروں کو ہٹایا جائے۔ ورنہ

خود خلیفہ دست بردار ہوں۔" یہ باتیں بظاہر سنجیدہ تھیں اور اگرچہ اب تک کی تمام شرارتوں کی بنیاد یہ باتیں نہیں تھیں، مگر اب انہیں باتوں سے کام لیا گیا اور اس شدت سے پراپیگنڈا کیا گیا کہ اچھے اچھے ذہن بھی اس سے اس طرح متاثر ہو گئے کہ انہوں نے تاریخ کو بھی متاثر کر دیا۔ اس وقت عشرہ مبشرہ اور بعنوانِ دیگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جن کو شوریٰ کے لیے نامزد کیا تھا ان میں سے تین بزرگ باقی تھے۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و سیدنا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔

سبائیوں کا خیال یہ تھا کہ بنی امیہ کے غیر معمولی اقتدار پھر مصلحت مملکت اور مصلحت امت کے مؤثر پروپیگنڈے کے ساتھ جب ان حضرات سے درخواست کی جائے گی تو ان میں سے کوئی ایک صاحب خلیفہ بننا ضرور منظور کر لیں گے۔ اس کے بعد حضرت عثمان اگر دست بردار ہو گئے تو آئندہ خلیفہ ہمارے زیرِ اثر ہوگا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دست بردار نہ ہوئے تو خانہ جنگی ہوگی۔ مقصد بہر حال حاصل ہو جائے گا، چنانچہ پہلے ان لوگوں نے ان بزرگوں کی خدمت میں خلافت کی پیش کش کی اور جب ان سب حضرات نے سختی سے تردید کر دی تو پھر بغاوت کا راستہ تھا جو اختیار کیا اور اس طرح نظام اسلامی کو درہم برہم کرنے کا نصب العین حاصل کیا۔ طبری کے حوالے سے تفصیل ملاحظہ ہو۔

علامہ ابن جریر طبری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا تقریر اور اس کے اثر کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

یہ لوگ چلے گئے اور یہ تہیہ کر کے اپنے اپنے شہروں کو واپس ہوئے کہ اب زمانہ حج کے قریب حج کے بہانہ سے آئیں گے اور اس وقت ان لوگوں سے غزوہ کریں گے، چنانچہ اپنے اپنے مقامات پر پہنچ کر سازش کے تمام مرکزوں سے خط و کتابت کی اور یہ طے کر لیا کہ ماہِ شوال میں سب مدینہ پہنچ جائیں، چنانچہ خلافت عثمانی کے بارہویں سال ماہ شوال میں یہ لوگ حج کے نام پر اپنے اپنے مقامات سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچے۔ روانہ ہونے والوں کی تعداد ہر جگہ سے چھ سو سے ایک ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ پوری تعداد اور ان کے رہنماؤں اور سرداروں کے ناموں کی تفصیل طبری وغیرہ میں دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو طبری صـ ۱۰۴ ج ۵

مصر کی پارٹی آئی تو عبداللہ بن سبا بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ سب پارٹیاں اس پر متفق تھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود دست بردار نہ ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ البتہ آئندہ خلیفہ کے متعلق آپس میں اختلاف تھا۔

اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، اہل بصرہ حضرت طلحہ کو اور اہلِ کوفہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اوّل ان لوگوں نے مدینہ سے تین تین منزل کے فاصلہ پر قیام کیا۔ وہاں سے تھوڑی تھوڑی تعداد میں مدینہ کے قریب پہنچے اور متفرق مقامات پر قیام پذیر ہو گئے۔

بصرہ والے مقام ذی خشب مین اہلِ کوفہ "اعوص" میں خیمہ زن ہوئے، جبکہ مصر والے مقام ذی مروہ میں مقیم تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد جو اہل مدینہ کا رنگ ہو گیا تھا اس سے یہ لوگ خائف تھے کہ وہ ہم لوگوں کو جیسے ہی دیکھیں گے قتل کر ڈالیں گے۔ یہ بھی سنا تھا کہ مدینہ میں فوج لگا دی گئی ہے۔ اس لیے طے کیا گیا کہ پہلے چند آدمی جا کر مدینہ والوں کا رنگ دیکھیں اگر یہ لوگ قتل کر دیئے گئے تو باقی لوگ مناسب منصوبہ بنا کر کام کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا دل مجرم تھا اس لیے خوفزدہ تھے۔ مدینہ منورہ میں نہ کوئی فوج تھی اور نہ مدینہ والے خود سر تھے کہ خلیفہ کے حکم کے بغیر کسی کو قتل کر دیں، چنانچہ جب ان نمائندوں نے مدینہ کی فضا ساکن دیکھی تو اب ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ کچھ لوگ ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ لوگ حضرت علی و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ ہم لوگ حج بیت اللہ کا ارادہ کیے ہوئے ہیں اور یہاں اس لیے آ گئے ہیں کہ صوبائی حکمرانوں سے جو شکائتیں ہیں وہ خلیفہ کے سامنے پیش کر سکیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ ان کو معزول کر دیں۔ ہم آپ سے یہ چاہتے ہیں کہ آپ اجازت دیدیں کہ ہمارے ساتھی بھی مدینہ منورہ میں آجائیں (جو باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور موسمی اثرات سے متاثر ہوئے ہیں)

ازواج مطہرات اور دوسرے حضرات نے کیا جواب دیا - ابن جریر کی روایت کے بموجب جواب کے الفاظ یہ ہیں۔

فکلهم ابی ونهی وقال بیض مایفرخن - طبری - ۱۰۴ - ج ۵

ان میں سے ہر ایک نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مدینہ میں داخل ہونے سے ان کو منع کیا اور کہا۔ انڈے ہیں جن کے بچے نہیں نکلے۔ (یعنی مبہم اور مشتبہ معاملہ ہے۔ نہیں معلوم ان کی تہ میں کیا ہے۔)

علامہ ابن جریر نے یہ روایت سند متصل کے ساتھ چار حضرات سے نقل کی ہے۔ محمد - طلحہ - ابو حارثہ اور ابو عثمان۔ انہیں چاروں حضرات سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے بعد ان سبائیوں کے وفود ان تینوں بزرگوں۔ حضرت علی حضرت زبیر۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچے اور خلافت کی پیشکش کی، مگر ان سب حضرات نے ان کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ انکے صاحبزادگان نے بھی ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے اور ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

لقد علم المسلمون ان جیش ذی المروه وذی خشب والاعوص ملعونون علی لسان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فارجعوا لاصحبکم اللہ - ص ۱۰۴ ج ۵ - طبری

مسلمان جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لشکروں پر لعنت بھیجی ہے جو ذی مروہ، ذی خشب اور الاعوص پر پڑاؤ ڈالیں گے۔

یہ جوابات سُن کر لوگ واپس ہو گئے اور ظاہر یہی کیا کہ وہ اس ارادے سے باز آگئے ہیں، اہلِ مدینہ مطمئن ہو گئے، مگر باز آنے کے بجائے اُن کا اقدام اس کے برعکس ہوا۔

فلما بلغ القوم عساکرھم کروا بھم فبغتوھم فلم یفجأ اھل المدینۃ الا والتکبیر فی نواحی المدینۃ (طبری ص ۱۰۵ ج ۵)

جب یہ لوگ اپنے لشکروں میں پہنچے تو لشکر والوں کو لے کر واپس ہوئے اور اچانک ان پر پہنچ گئے جنھوں نے ان کو واپس کیا تھا۔ (واپس جانے کے لیے کہا تھا) دفعتہً مدینہ والوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ کے چاروں طرف سے تکبیر کی آوازیں آرہی تھیں۔

مدینہ پہنچکر باغیوں کے لشکر لشکرگاہ میں ٹھہر گئے (چھاؤنی کی عمارتوں پر قبضہ کرلیا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حویلی کا محاصرہ کرلیا اور شہر میں اعلان کردیا کہ اس کو امن جو ہم پر حملہ نہ کرے۔ (صفحہ ۱۰۵ ج ۵ طبری)

مدینہ کے حضرات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے ان کے پاس پہنچے کہ آپ لوگ واپس چلے گئے تھے پھر کیوں آئے؟ تو جواب یہ دیا کہ خلیفہ نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے، اُس نے حاکم مصر کو لکھ دیا کہ یہ لوگ جب وہاں پہنچیں تو ان کو قتل کردو۔

کوفہ اور بصرہ والوں نے کہا کہ جب مصر والے واپس ہوئے تو ان کی مدد کے لیے ہم بھی پہنچ گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ جب آپ اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے تو پھر اتنی تیزی کے ساتھ یہ رابطہ کیسے قائم ہو گیا کہ سب اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب آپ لوگوں کا منصوبہ ہے جو آپ لوگ (روانگی سے پہلے ہی) مدینہ میں طے کر چکے تھے واللہ امر اُبرم بالمدینۃ۔

ان لوگوں نے جواب دیا کہ آپ حضرات جو کچھ سمجھیں، ہم تو اس خلیفہ کو معزول کرنا چاہتے ہیں۔ (طبری ص ۱۰۵ ج ۵)

علامہ ابن جریر طبری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اعتماد اسی روایت پر ہے جس کے راوی اول چار حضرات ہیں اس میں اختصار ضرور ہے، مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صوبائی مرکزوں کو اطلاع دی اور ان کو ہدایت کی کہ وہ امداد کے لیے فوجیں

بھیجیں۔ جہاں جہاں اطلاع پہنچی وہاں اضطراب پیدا ہوگیا۔ حضرات صحابہ اور حضرات تابعین خود بھی مدینہ طیبہ پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے اور انہوں نے اور مسلمانوں کو بھی آمادہ کیا (لیکن یہ حضرات ابھی مدینہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ بلوائیوں نے اپنا کام پورا کرلیا۔)

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ محاصرہ کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لاتے اور جماعت ادا کرتے تھے جمعہ کے روز حسبِ معمول تشریف لائے۔ نماز جمعہ کے بعد منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو سمجھایا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر پر لعنت فرمائی ہے جو ان مقامات پر پڑاؤ ڈالے گا جہاں تمہارے لشکروں نے پڑاؤ کیا ہے۔ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی یہ حدیث سنائی۔ حضرت محمد بن مسلمہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید کرتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا، لیکن فوراً ہی بصرہ کا وہ بدنام شخص حکیم بن جبلہ (جو پہلے ڈاکو تھا پھر سبائیوں کا لیڈر بن گیا تھا) کھڑا ہوا اور اُس نے زبردستی حضرت محمد بن مسلمہ کو بٹھا دیا۔

دوسری طرف حضرت زید بن ثابت تائید کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کو بلوائیوں کے دوسرے سرغنہ محمد بن ابی قیترہ نے زبردستی بٹھا دیا۔ اس پر دوسرے غازی صبر نہ کرسکے انہوں نے بلوائیوں پر پتھراؤ کرکے ان کو نکال دیا۔ پتھراؤ کا جواب بلوائیوں نے بھی پتھراؤں سے دیا۔ ان کے پتھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لگے۔ وہ بے ہوش ہوکر منبر سے گر پڑے اور بیہوشی کی حالت میں ان کو اٹھا کر مکان پر پہنچا دیا گیا۔ ص۱۰۶ ج ۵ ۔طبری

قبیلہ غفار کا ایک شخص تھا جہجاہ۔ اُس نے اس افراتفری میں حضرت خلیفہ رضی اللہ عنہ کا عصا چھین لیا اور گھٹنے پر رکھ کر توڑ دیا۔ یہ سرورِ کائنات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عصاء مبارک تھا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک بھی خطبہ کے وقت اس عصا پر رہا کرتے تھے۔ اس بے حرمتی کی سزا جہجاہ کو ملی۔ اس کے گھٹنے میں آکلہ (کینسر) ہوگیا۔ طبری ص۱۱۴ ج ۵، مگر جاء ماتم یہ توہین ہے جو اس بدنصیب نے کی۔

وظائف بند کرنے کا مطالبہ

علامہ طبری نے اس سلسلے میں ابی سعید (مولی ابی اسید انصاری رضی اللہ عنہم) کی طویل روایت پیش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اہلِ مصر کا ایک وفد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت موصوف مدینہ سے باہر اپنے ایک گاؤں میں قیام فرما تھے۔ یہ وفد وہیں پہنچا۔ اہل وفد نے اوّلاً چراگاہ وغیرہ کے متعلق اپنے اعتراضات پیش کئے اور اعتراضات میں قرآن پاک کی آیتوں کا حوالہ بھی دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے جوابات دیدیئے۔ پھر کچھ ایسے اعتراضات کئے جن کے متعلق خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تحقیق نہیں تھی۔ آپ

نے قصہ ختم کرنے کے لیے فرمادیا کہ اگر یہ سب کوتاہیاں بھی ہیں تو میں خدا سے توبہ کرتا ہوں۔ اس پر طرفین سے عہد و پیمان ہوگیا۔ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا کہ ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں معلوم ہوا کہ آپ لوگوں کا منشاء کیا ہے۔ ان لوگوں نے کھل کر کہا کہ اس وقت ہر ایک باشندۂ مدینہ کا بیت المال سے وظیفہ مقرر ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بند کیا جائے۔ صرف مجاہدین کے وظائف ہوں جو جہاد کر رہے ہوں یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو عمر رسیدہ (شیوخ) ہیں ان کو وظیفہ دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور فرمایا۔ پھر ان کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ لائے اہلِ مدینہ کے وظائف بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اس پر اہلِ مدینہ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ بنو اُمیہ کی چال ہے۔

(اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تو لوگوں کو ناراضگی ہوئی، مگر وفد کا مقصد پورا ہوگیا) اہل وفد اس کارروائی سے مطمئن ہوکر واپس ہوئے۔ (فرجع الوفد المصریون راضین) ص۱۰۷ ج ۵

اس کے بعد علامہ طبری نے کئی صفحات میں واقدی وغیرہ کے حوالے سے دو روائتیں نقل کی ہیں جن میں بلوائیوں کے راہنماؤں۔ نیز حضرت علی، حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) اور مروان وغیرہ کی گفتگوؤں، تقریروں اور انکی کوششوں کا تذکرہ ہے مگر یہ سب روایتیں بے سروپا ہیں، صحیح روایتوں کے خلاف ہیں اور خود آپس میں بھی متضاد ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم قرار دینے کے لیے انہیں ضعیف موضوع اور متضاد روایتوں سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ہم جب ان الزامات کا جواب دیں گے تو ان روایتوں کی حقیقت بھی واضح کریں گے۔ (انشاء اللہ)

اس کے بعد وہ زہرہ گداز اور جانکاہ قصہ ہے کہ ان بلوائیوں نے کس طرح ہجوم کر کے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جامِ شہادت نوش کرایا۔ اس کا تذکرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لہٰذا ہم اس کا ذکر کر کے حضرات ناظرین کو بھی روحانی کوفت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔

معترضہ کچھ صاحبان اس سے متأثر ہوتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کے بعد آئندہ خلافت کے لیے جو حضرات، بلوائیوں کے پیش نظر تھے وہ سب قریشی تھے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک قریشیت کے خلاف تھی، مگر یہ اُن صاحبان کی حد درجہ سادگی ہے۔ اس وقت سیاسی مصلحت ہی یہ تھی کہ کسی نمایاں قریشی کا نام لیا جائے تاکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف قریش کا تعاون حاصل ہو سکے۔ یعنی آئندہ خلافت کے لیے کسی قریشی کا نام لینا ازراہ

عقیدت واحترام نہیں تھا بلکہ بتقاضاء مصلحت تھا۔

اب آپ فیصلہ فرمائیے

سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ انگیز شورش کی پوری تاریخ آپ کے سامنے پیش کردی گئی۔ جو کچھ پیش کیا گیا۔ اس کا حوالہ دیا گیا۔ کوئی ایک بات بھی حوالہ کے بغیر نہیں لکھی اور حوالہ انہی کتابوں کا دیا جن کو مودودی صاحب نے تاریخ اسلام کا مستند ترین ماخذ قرار دیا ہے۔ (ص ۲۹۹ خلافت وملوکیت) یعنی تاریخ ابن جریر۔ ابن اثیر۔ ابن کثیر اور ابن خلدون، مزید برآں کہیں کہیں بخاری شریف اور ایک جگہ ترمذی شریف کا حوالہ دیا ہے۔

ہم نے کسی واقعہ کی توجیہہ یا تاویل نہیں کی، ہر ایک واقعہ کو پوری سادگی سے نقل کردیا ہے۔ جو باتیں لکھی ہیں وہ کم و بیش ان چاروں کتابوں میں ہیں، مگر ہم نے ابن جریر طبری کی "تاریخ۔ تاریخ الامم والملوک" کو سامنے رکھا ہے۔ زیادہ تر اسی کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔ پھر عبارت کا صرف مفہوم نہیں بیان کردیا بلکہ ترجمہ پیش کیا ہے اور بعض اہم عبارتوں کے الفاظ بھی نقل کردیئے ہیں۔ سیدنا حضرت عثمان کی تقریر کا۔ نیز جو گفتگوئیں ہوئی ہیں ان کا ترجمہ ایسا کیا ہے کہ اس کو تحت اللفظ کہا جاسکتا ہے۔

اب ہم آپ سے خود دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔

(ا) یہ تمام شورش جس کا سلسلہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے ..... شروع ہوا اس کی بنیاد قبائلی عصبیت تھی یا اقتدار کی کشمکش یا ایک منظم سازش تھی۔

(ب) یہ شورش قدرتی اور غیر اختیاری اضطراب تھا جو ظالم اور خائن کے مقابلہ میں عوام میں پیدا ہوجاتا ہے یا اس شورش کو جعل وفریب کرکے مصنوعی طور پر برپا کیا گیا تھا۔ یہ سازش سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ذات کے خلاف تھی یا قریش اور حضرات صحابہ کے خلاف اور بالواسطہ نظام اسلامی کے خلاف۔ اس کا منشا اصلاح تھا یا تخریب۔

(ج) قبائلی عصبیت سے اس میں کام ضرور لیا گیا، مگر اس کی چنگاریاں کہاں سلگیں۔

(د) جو واقعات پوری احتیاط سے بیان کیے گئے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ اقتدار کی جنگ نہیں تھی، کیونکہ اس کے حریف وہی حضرات ہوسکتے تھے جو ارکانِ شوریٰ تھے۔ یعنی جن کو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس قابل قرار دیا تھا کہ وہ بارِ خلافت سنبھال سکتے ہیں اور تمام صحابہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس تشخیص کو صحیح سمجھا تھا۔ یعنی سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ، سیدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جن کو تمام مسلمان

خلافتِ راشدہ کا اہل سمجھتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ ان کے حامی بھی ہو گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزرا اہلِ مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آئندہ خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ کوفہ والے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اور بصرہ والے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو۔

مگر ان حضرات کی طرف سے تحریک کی ابتدا یا تحریک کے وسط میں تو کوئی حرکت کیا ہوتی۔ آخری دور میں جب ان علاقوں کے نمائندے ان حضرات کے پاس پہنچے اور خلافت کی پیشکش کی تب بھی ان میں سے کسی میں کوئی لچک نہیں پیدا ہوئی بلکہ لچک اور میلان کے برخلاف ان حضرات نے پیش کش کرنے والوں کو ڈانٹا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا حوالہ دیتے ہوئے ان سب کو مستحق لعنت قرار دیا۔

(ہ) قبائلی عصبیت کی چنگاریاں خود بھڑکیں یا عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے اُن کو بھڑکایا، مگر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ امراء اور عمّال کے خلاف بھڑکی تھیں یا قریش کے خلاف۔ ابن خلدون کا فیصلہ یہ ہے کہ عربی قبائل جو جنگِ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے اور وہ اپنے آپ کو سفینۂ اسلام کا ناخدا سمجھنے لگے تھے عصبیت ان میں پیدا ہوئی۔ قریش کا اقتدار ان کو اکھرا۔ ان کے لیے حضرات صحابہ کا اقتدار بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا۔

ان کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اہلِ حجاز کی زمینیں عراق میں رہیں، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے فروخت کر دینے یا تبادلہ پر دینے کا اہتمام فرمایا۔

اہلِ مصر کو یہ بھی برداشت نہیں ہوا کہ باشندگانِ مدینہ کے وظیفے باقی رکھے جائیں۔ مسطورہ بالا تفصیلات میں یہ بات بھی سامنے آگئی کہ

(و) خط و کتابت اور داعیان (کارپردازانِ تحریک) کے ذریعہ جو پراپیگنڈا کیا گیا وہ ہر جگہ کے عامل اور مالی کے خلاف تھا (اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ)

(ز) یہ شکائتیں فتنہ پردازوں کی تصنیف کردہ تھیں، تعلیماتِ اسلام کے حامل اور ملّت اسلامیہ کے حقیقی محافظ حضرات صحابہ اور مرکزِ اسلام یعنی مدینہ طیبہ کے باشندوں نے نہ یہ شکائتیں کیں نہ شکائتیں کرنے والوں کے ہمنوا بنے (پھر آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ)

(ح) ابتدائی اعتراضات اور تھے اور جب سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کا جواب دیدیا اور اہل مدینہ یہاں تک مطمئن ہو گئے کہ حضرت خلیفہ رضی اللہ عنہ سے ان شورہ پشتوں کے قتل کا مطالبہ کرنے لگے تب اُن امراء کا نام لیا گیا جو سیدنا حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ سے کچھ قرابت رکھتے تھے۔

(ط) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دینے کے بعد اس پروپیگنڈے کی اور زیادہ ضرورت ہوئی اور خوب ڈھول پیٹ پیٹ کر یہ پراپیگنڈا کیا گیا، کیونکہ ان ننگ انسانیت قاتلوں کے پاس صرف یہی ایک بہانہ تھا جس سے وہ اپنے اس وحشتناک اقدام کی کچھ جوابدہی کر سکتے تھے۔ پھر جب سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں جنگ کی نوبت آگئی تو اس پروپیگنڈے میں فی الواقع جان پڑ گئی اور یہی جان ہے جو آج تک اس پروپیگنڈے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ نیکاں برد

✡

ذکرِ حق سے صیقلِ کامل ہوا
محو دل سے نقشِ ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے
جلوہ فرما وہ مہِ کامل ہوا
بزم میں دیکھا کیے اس ناز سے
جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا
گھول کر کیا جانیے کیا دے دیا
حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا

(حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ)

✡

زباں میری بنا دے یا الٰہی! ترجمانِ دل
زباں سے ہو وہی اظہار، جو کچھ ہو بیانِ دل
زباں تسبیح میں شاغل، دل اسکی یاد سے غافل
لبوں پر ذکرِ حق جاری مگر ساکت زبانِ دل
خدا جانے کہاں دل ہے کہاں پر اسکی منزل ہے
نہیں ملتا سراغِ دل، نہیں ملتا نشانِ دل
اگر ساقی تری چشمِ فسوں گر کام کر جائے
بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل

(حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ)

انوارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرت مولانا بشیر احمد پسروری مدظلہم

حضرت عدی رضی اللہ عنہ

آپ ۹ھ میں مشرف باسلام ہوئے۔ آپ خاندانی طور پر بنی اسرائیل میں سے تھے اپنے مذہب میں راہب اور رہنما تھے بعد میں عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ ایک سو اسی برس کی عمر پاکر کوفہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

اسلام سے نفرت

حضرت عدی فرماتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی خبر ملی تو میرے دل میں نہایت شدید نفرت اور کراہت پیدا ہوئی حتیٰ کہ اسی نفرت کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر قیصرِ روم کے پاس چلا گیا اور وہاں بھی آپ کی پیغمبری سے انتہائی نفرت اور کڑھن محسوس کرتا رہا۔ لیکن وطن کی محبت رشتہ داروں کی یاد اور دوست احباب کا پیار جب یاد آتا تو دل چاہتا کہ اڑ کر وطن پہنچوں۔ اسی کش مکش میں کتنی مدت گزر گئی آخر ایک دن میں نے اپنے دل میں سوچا کہ چلو اس آدمی (حضور) کے پاس چل کر دیکھیں اگر وہ اپنے دعویٰ نبوت میں جھوٹا ہوا تو میرا کیا بگاڑ لے گا اور اگر سچا ہوا تو تحقیق ہی ہو جائے گی چنانچہ یہ ارادہ لے کر میں روم سے چل پڑا۔

اخلاقِ نبوی کی پہلی کرن

راستے میں ہی میری پھوپھی مجھے ملیں۔ مجھے اپنی پھوپھی سے بے پناہ محبت تھی مدت کے بعد ملاقات ہوئی مسکراتے ہوئے فرمانے لگیں عدی مبارک ہو میں ایسے بزرگ کے پاس سے آرہی ہوں جس نے میرے ساتھ وہ حسن سلوک کیا ہے کہ تمہارا باپ حاتم طائی بھی نہ کرتا تم ضرور حضورؐ کے پاس جاؤ جو شخص بھی حضورؐ کے پاس پہنچا اسے ضرور نفع ہوا۔ عدی تم ضرور ان کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا بھلا میں بھی تو سنوں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔

اس نے کہا جب ہم گرفتار ہوکر حضورؐ کے پاس پہنچے اور صف بستہ آپؐ کے سامنے کھڑے کئے گئے۔ میں نے عرض کی حضرت میں بہت بوڑھی ہوگئی ہوں میں بے سہارا اور بے آسرا ہوں۔ میرا کمانے والا بھی جاتا رہا ہے۔ آپ مجھ پر احسان فرمائیں۔ حضورؐ نے پوچھا تمہارا کمانے والا کون تھا۔ میں نے کہا میرا بھتیجا عدی بن حاتم۔ حضورؐ نے فرمایا وہی عدی جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ میں نے کہا حضورؐ مجھ پر ضرور احسان فرمائیں اس کے بعد حضورؐ کسی ضروری کام کے لئے تشریف لے گئے۔ جب واپس تشریف لائے تو آپ کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جس کا نام حضرت علیؓ ہے۔ انہوں نے مجھے کہا تم نے حضورؐ سے رہائی تو مانگ لی ہے اور حضورؐ تو بڑے سخی ہیں۔ تم بہت بوڑھی ہو واپس کیسے جاؤ گی؟ حضورؐ سے سواری بھی مانگ لو۔ چنانچہ میں نے حضورؐ سے سواری بھی مانگی حضورؐ نے سواری بھی عطاء فرمائی۔ اے عدی میں نے اپنی آنکھوں سے ایسا بلند اخلاق اور سخی آدمی کوئی نہیں دیکھا تم ضرور حضورؐ کے پاس جاؤ۔

معجزہ

حضرت عدی فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے میرے شوق کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ میں فوراً مدینہ منورہ کی طرف چل پڑا تمام راہ بار بار میرے دل میں یہ آرزو ابھرتی رہی کہ جب میں حضورؐ کی زیارت کا شرف حاصل کروں تو مجھے یہ سعادت نصیب ہو کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاتھ اپنے بابرکت ہاتھ میں لے لیں۔ مدینہ عالیہ پہنچتے ہی یہ چرچا ہوا کہ عدی آگیا۔ جب میں دربارِ نبوی میں حاضر ہوا تو لوگوں نے میرا تعارف کرایا کہ حاتم طائی کا فرزند ہے اس کا باپ جود وسخا اور غربا پروری میں دنیا بھر میں مشہور تھا۔ یہ سن کر جناب نے مزید شفقت سے توجہ فرمائی اور تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم کر کے جب قصرِ نبوت کی طرف روانہ ہوئے تو کمال محبت سے میرا ہاتھ اپنے پاک ہاتھ میں لے کر چلنے لگے اور میری آرزو پوری ہوئی۔

محتاجوں اور بیکسوں پر شفقت

قصرِ نبوت کو جاتے ہوئے راستے میں ایک ضعیف العمر بڑھیا ملی جس کے پاس ایک چھوٹا سا بچہ تھا وہ کچھ اپنے معروضات پیش کرنا چاہتی تھی۔ جناب راستہ چھوڑ کر راستے کے کنارے پر اس غریب و بیکس بڑھیا کی معروضات انتہائی ہمدردی اور کمال شفقت کے ساتھ دیر تک سنتے رہے بڑھیا کی ضروریات کا مناسب انتظام فرما کر آپ حجرہ مبارک کی طرف روانہ ہوئے میں جب دور تھا تو آپؐ کو کامیاب فاتح اور بادشاہ خیال کرتا تھا۔ مگر یہاں شاہی غرور تمکنت کی بو بھی نہ تھی۔ ہاں اخلاقِ نبوت دوپہر کے سورج کی طرح چمک رہے تھے۔

اخلاقِ فاضلہ

جب ہم حجرہ مبارک میں داخل ہوئے تو جناب نے ایک بڑا تکیہ میری طرف بڑھایا تاکہ میں اس پر تکیہ لگا کر بیٹھوں وہ تکیہ کھجور کی چھال سے بھرا ہوا تھا۔ بیٹھنے کے بعد جناب نے فرمایا اے عدی تم کیوں بھاگے بھاگے پھرتے ہو کیا اس لیئے کہ کہیں یہ نہ کہنا پڑے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں؟ تو تم ہی بتاؤ کیا خدا کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ یا اس لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہو کہ یہ نہ کہنا پڑے کہ اللہ سب سے بڑا ہے تو کیا اللہ عزوجل سے بڑی چیز ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا ہرگز نہیں، تو آپؐ نے فرمایا اے عدی بن حاتم مسلمان ہو جاؤ، محفوظ رہو گے۔ آپ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی۔ میں نے عرض کیا حضرت میں خود ایک دین کا پیرو ہوں یہ سنتے ہی آپ نے فرمایا اے عدی میں تم سے زیادہ تمہارے دین سے واقف ہوں۔ میں نے عرض کیا اچھا آپ میرے دین کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں آپ نے فرمایا ہاں کیا تم فرقہ رکوسیہ میں سے نہیں ہو؟ کیا تم اپنی قوم کے مال سے چوتھائی کھانے والے نہیں ہو۔ میں نے عرض کیا بے شک یہی بات ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھائی تو تمہارے مذہب میں تمہارے لئے حلال نہیں ہے میں نے عرض کی آپ کا فرمانا بجا ہے۔ عدی کہتے ہیں کہ آپ نے ابھی بات ختم نہ فرمائی تھی کہ میری اکڑ اور سختی نکل چکی تھی۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا۔ یہودیوں پر اللہ کا غضب ہوا اور عیسائی گمراہ ہو چکے۔

پھر فرمایا میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کون سی چیز تمہیں اسلام لانے سے روک رہی ہے تم اپنے دل میں کہتے ہو کہ مسلمان مفلس اور کمزور ہیں اور اتنے بے بس ہیں جن کو اہلِ عرب نے نکال پھینکا ہے۔ اللہ کی قسم کچھ عرصہ کے بعد یہ کمزوری انتہائی عظمت اور قوت کے ساتھ بدل جائے گی۔ اے عدی کیا تو اس لیے اسلام نہیں لاتا کہ مسلمان مفلس اور غریب ہیں اللہ کی قسم وہ وقت قریب ہے کہ قیصر وکسریٰ کے خزانے ان کے قبضہ میں آجائیں گے۔ میں نے عرض کیا کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ہاں کسریٰ بن ہرمز کے خزانے۔ پھر آپ نے فرمایا اے عدی تم حیرہ شہر سے واقف ہو۔ میں نے عرض کیا دیکھا تو نہیں۔ سنا ضرور ہے آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور اللہ پاک اس دین کو پورا کرے گا یہاں تک کہ تم دیکھ لو گے کہ پردہ نشین عورت تن تنہا حیرہ سے آئیگی اور بیت اللہ کا طواف کرے گی اور کسی کو ساتھ نہ لے گی اور اس کو سوائے اللہ کے کسی کا بھی خوف نہ ہو گا۔

اور اگر تمہاری زندگی اور دراز ہوئی تو تم دولت کا وہ دور بھی دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر کر سونا یا چاندی

اس نیّت سے لے کر نکلے گا کہ کوئی اس کو قبول کرلے مگر اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔

حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا جونہی اسلام کا پاک کلمہ میری زبان پر آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا چہرہ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک اٹھا اور آپ بہت خوش ہوئے۔

اتنے میں ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کرنے لگا کہ میں نہایت فاقہ زدہ ہوں اس کے پیچھے ایک اور شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت میں مسافر ہوں اور سفر خرچ ختم ہوگیا ہے ان کی مصیبت سن کر آپ بڑے بے چین ہوئے آپ نے پہلے اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر ارشاد فرمایا اے لوگو قیامت کے دن ہر شخص کو خدا کے حضور حاضر ہونا ہے جب کہ بندے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا آپس میں بالمشافہ گفتگو ہوگی، تو اللہ تعالےٰ سوال فرمائیں گے اے بندے بتا کیا میں نے تیرے پاس اپنا رسُولؐ نہیں بھیجا تھا جس نے میرے احکام تم کو پہنچائے ہوں؟ کیا میں نے تم کو کان اور آنکھ نہیں دی تھی کیا میں نے تم کو مال اور اولاد نہیں دی تھی؟ بتاؤ تم کیا لے کر آئے ہو۔ یہ سن کر آدمی آگے پیچھے دائیں بائیں نظر دوڑائے گا تو آگ کے شعلوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ لہٰذا آگ سے بچاؤ کی تدبیر کر لو، صدقہ خیرات دو اپنی ضرورت سے زائد مال میں سے کوئی ایک صاع دے کوئی نصف صاع کوئی ایک مٹھی کوئی کھجور کا ایک ٹکڑا اگر کسی کو یہ بھی میسّر نہ ہو تو میٹھے بول ہی کے ذریعہ نجات حاصل کرو مجھے تمہارے فقر و فاقے کا اندیشہ نہیں اس لیئے کہ اللہ پاک ضرور تمہاری اعانت کرے گا اور بہت کچھ تمہیں دے گا۔

حضرت عدی یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ کسریٰ کے خزانے لوٹنے والوں میں میں خود شریک تھا اور آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ پردہ نشیں عورتیں تن تنہا حیرہ سے آتی ہیں اور بیت اللہ کا طواف کر کے واپس جاتی ہیں اور ان کو اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا اور قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تیسری بات[1] (فراوانیٔ مال) بھی ہو کر رہے گی اس لیئے کہ رسُولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرما چکے ہیں۔

حضرت عدی نے مختار ثقفی کے زمانہ میں ۶۸ھ میں وفات پائی۔

آپؓ ہمیشہ باوضو رہتے تھے اور ذکر الٰہی بکثرت کرتے رہتے تھے (اصابہ ج ۲ ص ۴۶۱ و بدایہ ج ۵ ص ۶۶)

---

[1] حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ مال کی اس کثرت کا زمانہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دَور میں گزر چکا ہے۔

شرک اور توحید کی حقیقت

حضرۃ مولانا سید نور الحسن شاہ صاحب مدظلہ ملتان

مشرکین اللہ رب العزت کو جانتے تھے، مانتے تھے، ذات باری تعالیٰ کے ساتھ صفات ربانی کے بھی قائل ومعترف تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے تھے، پھر قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید سے کیوں چڑتے تھے؟ آخر کس اختلاف و خلاف کی بناء پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ رسولؐ سے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ رحمتِ عالمؐ وصحابہ کرامؓ کو دردناک مظالم ولرزہ انگیز شدائد کا ہدف ونشانہ بن کر، آگ میں جل بھن کر، خاک وخون میں تڑپ تڑپ کر، وطنِ عزیز سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آنا پڑا۔ اس پر بھی ان کی آتش عناد وانتقام ٹھنڈی نہ ہوئی، یہاں بھی اہلِ حق کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جنگ وجدال اور حرب وضرب کا بازار گرم کیا، جس کے نتیجے میں سینکڑوں پروانگانِ توحید ورسالت نے شہادت پائی اور صنادیدِ قریش وعمائد ورؤساء مکہ واصلِ جہنم ہوئے۔ لعنہم اللہ تعالیٰ۔

آخر وہ وجہِ نزاع، اصلِ خلاف، بناءِ عناد اور اساسِ فتنہ وفساد کیا تھی؟

وجہ نزاع وخلاف

جہاں تک مسئلہ کے مثبت پہلو کا تعلق ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اہلِ توحید واہلِ شرک کے مابین کوئی خاص وجہ نزاع وخلاف نظر نہیں آتی۔ البتہ منفی پہلو سے دونوں میں شدید بُعد اختلاف تھا۔

مشرکین مکہ خدا کو بھی مانتے تھے۔ خدا کی بھی عبادت کرتے تھے، لیکن قرآن نے خدا ہی کی عبادت کی دعوت دی، اسلام خدائے واحد کے سوا ہر معبود کی نفی کرتا ہے اور انسانیت کو صرف اللہ واحد کی بارگاہ میں جھکاتا ہے۔ سارا خلاف اسی بھی اور ہی کا تھا۔

کتاب اللہ اور احادیثِ نبویہ سے اسی وجہ خلاف کا ثبوت ملتا ہے۔ مشرکین معذبین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

انھم کانوا اذا قیل لھم لا الہ الا اللہ — بیشک وہ ایسے تھے کہ جب ان سے کہا جاتا

يستكبرون ۝ ويقولون أئنا لتاركوا آلهتنا لشاعرٍ مجنونٍ ۝ (پارہ ۲۳، الصفّٰت، رکوع ۲)

تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ تکبر کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ کی وجہ سے چھوڑ دیں؟

مشرکین اللہ رب العزت کی الوہیت کا اقرار تو کرتے تھے، انہیں انکار و غرور تھا تو اللہ تعالیٰ کی وحدتِ الوہیت پر۔

جب داعیٔ توحید صلی اللہ علیہ وسلم لا الٰہ الا اللہ کی ضرب سے غیر اللہ کی معبودیت و الوہیت کی نفی کرتے اور معبودانِ باطل کو پاش پاش فرماتے تھے تو قریش مکہ نہ صرف انکار و استکبار کرتے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے، بلکہ آپے سے باہر ہو کر رحمتِ عالمؐ کو ہدفِ سب و شتم بناتے اور شانِ اقدس و اطہر میں گستاخیاں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) اس شاعر اور دیوانے کے کہنے پر ہم اپنے معبودوں کو تھوڑا چھوڑ دیں گے، ہم اللہ کے ساتھ ان کی پرستش برابر کرتے رہیں گے۔ ہم انہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

اگلی سورت میں اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، مشرکین سے متعلق ارشاد فرمایا:

وقال الكفرون هذا ساحر كذاب ۝ اجعل الالهة الها واحداً ان هذا لشيءٌ عجاب ۝ (۲۳ - شروع سورہ صٓ)

اور کافروں نے کہا (معاذ اللہ) یہ جادوگر ہے۔ جھوٹا، کیا اس نے اتنے معبودوں (کی جگہ) ایک ہی معبود بنا دیا۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے

تو مشرکین مکہ صرف ایک معبود کے تصوّر ہی سے بیگانہ تھے، خدائے واحد کو معبودِ واحد ماننے میں انہیں صرف تامّل و تردّد ہی نہیں بلکہ سخت تعجب تھا، محض خدائے واحد کی الوہیت و عبادت کی دعوت پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نشانۂ جور و جفا اور ہدفِ سب و شتم بنایا گیا۔ کبھی شاعر و مجنون کہا گیا تو کبھی ساحر و کذاب، یعنی جادوگر اور جھوٹا (معاذ اللہ)

بارگاہِ رسالت میں یہ گستاخیاں محض اس وجہ سے تھیں کہ آپ ہمارے معبودوں کی نفی کر کے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔ یہ بات ناقابلِ فہم و قبول اور باعثِ حیرت و استعجاب ہے۔

تو ان مشرکین کا سارا جوش، غصّہ اور ملال و اشتعال محض لا الٰہ الا اللہ پر تھا، غیر اللہ کی عبادت کی نفی پر وہ مشتعل ہو جاتے تھے اور رحمت اللعالمینؐ کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و عداوت کی آگ میں جل مرتے تھے

قرآن کریم کی تیسری شہادت ملاحظہ ہو:-

اور جب آپ قرآن میں اکیلا اپنے رب کا

و اذا ذکرت ربك فی القرآن وحده	ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت کرتے ہوئے پیٹھ
ولوا علیٰ ادبارهم نفوراً (۱۵-بنی اسرائیل، ع ۵)	پھیر کر چل دیتے ہیں۔

یوں تو وہ خود خدا کا ذکر کرتے تھے، لیکن جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف خدائے واحد کا ذکر کرتے دیکھتے تھے تو برداشت نہیں کر سکتے تھے، دفورِ نفرت سے مجبور ہو کر الٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے۔

چوتھی جگہ ارشاد ہوتا ہے:

و اذا ذکر الله وحدهٗ اشمأزّت	اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان
قلوب الذین لا یؤمنون بالاخرة و	لوگوں کے دل منقبض ہوتے ہیں، جو آخرت پر
اذا ذکر الذین من دونه اذا هم	ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا اوروں
یستبشرون ۵ (۲۴، زمر، ع ۵)	کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو اس وقت وہ خوش
	ہو جاتے ہیں۔

جب اللہ واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل نفرت و کراہت اور غم و غصہ سے بھر جاتے ہیں۔ توحید الٰہی سے ناگواری کے باعث ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل گھٹ جاتے ہیں اور غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ ملایا جائے تو مارے خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں، باغ باغ ہو جاتے ہیں۔

ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو۔

ذلکم بانهٗ اذا دعی الله وحده کفرتم	یہ اس واسطے ہے کہ جب اکیلا اللہ کو پکارا جاتا
و ان یشرك به تؤمنوا فالحکم لله العلی	تھا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی
الکبیر (۲۴-مومن، ع ۲)	کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔ پس یہ خدائے
	علی و کبیر کا فیصلہ ہے۔

∴

مشرکین جہنم میں اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے اور جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت پوچھیں گے، رب العزت کی طرف سے جواب دیا جائے گا کہ یہ دردناک ہمیشگی کا عذاب محض اس وجہ سے ہے کہ تم خدائے واحد کی وحدانیت کا کفر و انکار کرتے تھے اور اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جاتا تھا تو فوراً ایمان و یقین لے آتے تھے

اس پر خدائے علی و عظیم کا فیصلہ یہی ہے کہ تم جہنم میں ہمیشہ جلتے رہو۔

حقیقت صاف صاف اور واضح طور پر سامنے آگئی کہ اللہ کی پکار کے وہ منکر و مخالف نہیں تھے، ان کا کفر و انکار اللہ واحد کی پکار پر تھا، سارا خلاف، سارا کفر ایک اللہ کی عبادت پر تھا۔ وہ منکر تھے تو وحدتِ الوہیت و وحدتِ عبادت کے! وہ مخالف تھے تو توحید باری تعالےٰ کے! بہرحال مشرکین وحدتِ الوہیت اور توحید باری تعالےٰ کے منکر و مخالف تھے اور تعدّدِ الٰہ و کثرتِ الوہیت کے قائل۔

اسلام ادھر اسلام الٰہ واحد کی الوہیت کا داعی و علمبردار ہے۔ یہ متعدد اور بے شمار الٰہ تو کجا! دوسرے اِلٰہ کے تصور کا تحمل نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وقال اللہ لا تتخذوا الٰھین اثنین	اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ تم دو معبود مت
انما ھو الٰہٌ واحدٌ فایای فارھبون	بناؤ، معبود تو بس وہی ایک ہے، پس مجھ
(۱۴ - نحل - ع ۷)	ہی سے ڈرو،

دین اسلام میں، دعوتِ محمدی میں دوسرے متعدد معبودوں کی گنجائش کہاں؟ یہاں تو ایک اللہ کے بعد دوسرے معبود کی بھی جگہ نہیں، یہاں کثرت کہاں؟ یہاں تو دوئی کے لیے بھی گنجائش نہیں۔

تو مشرکین اور اہلِ اسلام کے درمیان وجہ نزاع و خلاف خدا تعالیٰ کی معرفت و عبادت نہیں، بلکہ باعثِ عناد و فساد یہ ہے کہ اسلام وحدتِ عبادت کا علمبردار ہے، یہاں عبادت و الوہیت میں دوئی اور شرک کفر ہے۔ مگر مشرکین کو وحدتِ الوہیت و توحیدِ ربانی سے چڑ ہے، اسی بنیادی خلاف و نزاع کی بنا پر رسول کریم و یارانِ نبی نے وہ مظالم و شدائد برداشت کیے جن کی تاریخِ انسانیت میں مثال نہیں ملتی اور اسی اختلاف کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کتوں کی موت مرے اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنے۔

اسلامی پیڈ پچاس پیسے میں

خط لکھنے کا اسلامی پیڈ ختم نبوت کی احادیث کے بلاک سے مزین عمدہ کاغذ رنگین چھپائی ۲۵ کاغذ مجلد پچاس پیسے، ۵۰ کاغذ مجلد ایک روپیہ اور سو کاغذ مجلد دو روپیہ ہیں۔ ڈاک ٹکٹ یا منی آرڈر بھیج کر منگوائیں۔ وی۔ پی نہیں ہوگا۔ ڈاک خرچ معاف۔ رجسٹری سے منگوانے کے لئے پچاس پیسے کے ٹکٹ زائد روانہ کریں۔ پتہ: محمد رمضان۔ التقویم۔ مدرسہ تعلیم الفرقان۔ توحید نگر۔ پاکی واڑہ کراچی نمبر ا سندھ

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔

دعاء کی افادیت و اہمیّت

وللدعوات تاثیر بلیغ وقد ینفیہ اصحاب الضلال

(قصیدہ بدء الامالی)

لا تسئلن بنی آدم حاجۃ وسئل الذی ابوابہ لا تحجب

اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ وبنی آدم حین یسأل یغضب

(فیض القدیر)

خطیب السلام حضرۃ مولانا محمد اجمل صاحب مدظلہ خطیب جامع مسجد رحمانیہ لاہور

عن النعمان بن بشیرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدعاء ھو العبادۃ ثم قرأ وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین۔

(احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دُعا عین عبادت ہے۔ اس کے بعد آپ نے سند کے طور پر یہ آیت پڑھی "وقال ربکم ادعونی" تمہارے رب کا فرمان ہے کہ مجھ سے دُعا کرو اور دعا مانگو میں قبول کروں گا اور تم کو دوں گا جو میری عبادت سے متکبرانہ روگردانی کریں گے۔ انکو ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں جانا ہوگا۔

عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دُعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس شئ اکرم علی اللہ من الدعاء (ترمذی۔ ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے یہاں کوئی چیز اور کوئی عمل دُعا سے زیادہ مکرم نہیں۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فتح له منکم باب الدعاءِ فتحت له ابواب الرحمۃ ۔وما سئل اللہ شیئاً یعنی احب الیہ من ان یسئل العافیہ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ تعالیٰ کو سوالوں اور دعاؤں میں سب سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ بندے اس سے عافیت کی دُعا کریں (یعنی کوئی دُعا اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ محبوب نہیں)

عن ابی ھریرہ رض قال قال رسول اللہ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

عن ابن مسعود رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلوا اللہ من فضلہٖ فان اللہ یحب ان یسأل وافضل العبادۃ انتظار الفرج ۔ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ سے اس کا فضل مانگو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کے بندے اس سے دعا کریں اور مانگیں اور فرمایا کہ اس بات کا انتظار کرنا کہ وہ بلا اور پریشانی کو دُور فرمائے گا اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔

عن ابن عمر رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء (ترمذی، احمد)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دُعا کارآمد اور نفع بخش ہوتی ہے۔ ان حوادث میں بھی جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے۔ پس اے خدا کے بندو دعا کا اہتمام کرو۔

عن جابر رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا ادلکم علی ما ینجیکم من عدوکم ویدر لکم ارزاقکم تدعون اللہ فی لیلکم ونھارکم فان الدعاء سلاح المؤمن (مسند ابویعلی)

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں جو تمہارے دشمنوں سے تمہارا بچاؤ کرے اور تمہیں بھرپور روزی دلائے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے اللہ سے دعا کرو رات میں اور دن میں

کیونکہ دعا مومن کا خاص ہتھیار۔ یعنی اس کی خاص طاقت ہے۔

وعن سلمان الفارسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یردّ القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البرّ (ترمذی)

(ترجمہ) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔

فائدہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ اندازِ بیان اس چیز کو ظاہر کر رہا ہے کہ بلا اور مصیبت کے دفع کرنے میں دعا کو خاص تاثیر حاصل ہے۔ جو کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔ اگر آدمی پر کسی مصیبت کے آنے کا اندیشہ ہو اور اس کو دُعا کی توفیق ہو جائے۔ تو پھر اس ذریعہ سے وہ مصیبت دور اور دفع ہو جائیگی اور وہ اس سے نجات پا جائے گا۔

الدعاء مفتاح الرحمۃ۔ والوضوء مفتاح الصلوٰۃ۔ والصلوٰۃ مفتاح الجنۃ۔

(جامع الصغیر للسیوطی)

(ترجمہ) دعا رحمت کی کنجی ہے اور وضو نماز کی کنجی ہے اور نماز جنت کی کنجی ہے۔

دعا انسانی فطرت کا تقاضا ہے

انسان دنیاوی خوشحالی اور مادی ترقی کی بنا پر خواہ اپنے رب سے کتنا ہی دُور چلا جائے اور غفلت و نسیان کے کتنے دبیز پردے اس کے دِل پر پڑ جائیں۔ بہر حال مصائب کے ہجوم اور مبتلا آلام ہونے کے وقت بے اختیار، بے ساختہ فریاد اور دعا کے لیے اس کے ہاتھ اٹھ ہی جاتے ہیں۔ دل مضطرب سے معاً الفاظ پکار بن کر نکلتے ہیں۔ بے ساختگی کے عالم میں نکلی ہوئی یہ آواز دعا کہلاتی ہے۔ مصیبت میں پکارنے کی جبلت ایک مسلمہ حقیقت ہے انسان اپنے اس جبلی ادراک کے تحت ایک برتر ہستی کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے اور اسے فریادرس سمجھ کر امداد و اعانت کا طالب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس فطری تقاضے کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ فرمایا:

اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ۔ (الزمر۔ آیت ۸)

(ترجمہ) جب انسان کو کوئی نقصان پہنچے تو اپنے پالنے والے کو پکارتا ہے اور ہمہ تن اسکی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ

كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَا اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (سورۃ یونس۔ آیت ۱۲)

(ترجمہ) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کروٹ پر۔ یا بیٹھے یا کھڑے (ہر حال میں) ہمکو پکارے چلا جاتا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف کو دُور کر دیتے ہیں تو ایسا (بے پرواہ بن کر) چل دیتا ہے۔ گویا اس تکلیف کے دُور کرنے کے لیے) جو اس کو پہنچ رہی تھی۔ ہمکو (کبھی) اس نے پکارا ہی نہ تھا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (سورۂ یونس۔ آیت ۲۲)

(ترجمہ) وہی خدا ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے (سفر کی سہولتیں مہیا کرتا ہے) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ لوگوں کو خوشگوار ہوا کی مدد سے لیکر چلتی ہیں اور لوگ ان کی رفتار سے خوش ہوتے ہیں کہ (ناگاہ) کشتی کو تیز تند ہوا کا جھونکا آلگتا ہے اور پانی کی لہریں ہر طرف سے چڑھ آتی ہیں اور وہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ اب تو (بُری طرح) گھیرے میں آپھنسے ہیں تو ایسے موقع پر خلوص دل سے خدا ہی کی بندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں (کہ اے پروردگار) اگر تو ہم کو اس سے نجات دے تو ہم ضرور ہی تیرے شکرگزار ہونگے، لیکن جب وہ انکو اس بلا سے نجات دے دیتا ہے تو وہ خشکی پر پہنچتے ہی ناحق طور پر سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال دُعا بیچارگی اور درماندگی کی حالتِ اضطرار میں لطف و رحم کی وہ پکار ہے جو اطمینان قلب کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ جب کوئی خطرہ خوفناک شکل میں اسکی طرف پیشقدمی کرتا ہے۔ یا جب کسی امید کے چراغ کی لو مدھم ہونے لگتی ہے تو وہ بے اختیار اس پاک ذات کی طرف لوٹتا ہے۔ جو ارض و سمٰوات کی خالق اور کائنات کی مدبّر ہے جس کے قبضہ قدرت میں یہاں کے ہر وجود کی تقدیر ہے۔

اذا مسکم الضر فالیہ تجئرون (النحل۔ آیت ۵۳)

(ترجمہ) جب تم کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اللہ تعالےٰ کے آگے روتے اور گڑگڑاتے ہو۔

دعا کی حقیقت

اسکی حقیقت نیاز مندی ہے۔ یعنی اپنی حاجت اور احتیاج کو پیش کرنا کہ اے اللہ! ہمیں یہ دیدے۔

آیت اور حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا عین عبادت ہے۔ خواہ کسی قسم کی ہو۔ دینی ہو یا دنیوی ہو، مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو۔ خواہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔

حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ تعالےٰ سے مانگا کرو اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں، مگر دُعا ایک ایسی عبادت ہے کہ اگر دنیا کے لیے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے۔ مثلاً مال مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے۔ جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا۔ حدیث شریف میں ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ۔ کہ جو شخص اللہ تعالےٰ سے نہ مانگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں جو برابر مانگتا رہے۔ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

ہر تدبیر میں انسان اپنے جیسے کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے۔ خواہ قالاً ہو یا حالاً اور دعا میں ایسے سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور عقل بھی یہی کہے گی کہ جو سب سے زیادہ قادر تر ہے۔ اسی سے مانگنا اکمل وانفع ہے۔

پس یقیناً یہ تدبیر (دعا) ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اور تدبیر بھی حق تعالےٰ کی مشیت اور ارادہ ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ تو جو شخص حق تعالےٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ دُعا صرف امور غیر اختیاریہ کے ساتھ خاص نہیں۔ جیسا کہ عام خیال ہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے۔ وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے۔ بلکہ امور اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے۔ اصل کام تو اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب وعلامات محض بندوں کی تسلی و دیگر حکمتوں کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔

این سببہا در نظر پردہاست در حقیقت فاعل ہر شئے خداست

(شریعت اور طریقت۔ ص ۱۴۶/۱۴۷)

ضرورتِ دعا

کوئی شخص ایسا نہ ہوگا۔ جس کو صلاح و فلاح کی ضرورت نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے دارین کی صلاح وفلاح کے

واسطے اسباب والواب موضوع فرما دیئے کہ اہل حاجت ان سے مدد لیں اور عقبات ومہالک سے نجات پائیں۔ ان اسباب میں سے بجز دعا کے جتنے اسباب ہیں ان کے سببات خاص خاص امور ہیں، چنانچہ اسباب طبعیہ کا (مثل زراعت وتجارت وطبابت کے) اصلی مقصود فلاح دنیوی بنایا گیا ہے۔ گو بواسطہ معین دین بھی ہو اور اسباب شرعیہ کا (مثل صوم وصلوٰۃ وحج کے) مقصود بالذات فلاح دینی ٹھہرایا گیا۔ گو بالعرض نافع دنیا بھی ہو۔ مگر صرف دُعا ایک ایسی چیز ہے کہ فلاح دین ودنیا دونوں کے لیے بالمساوات ایک مرتبہ میں مشروع وموضوع ہے جس سے بوجہ اس جامعیت کے اس کی وقعت وعظمت ظاہر ہے۔ اس لیے قرآن وحدیث میں نہایت درجہ اسکی ترغیب وفضیلت وتاکید جابجا وارد ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا جس شخص کو دعا کی توفیق ہوگئی اس کیلیے قبولیت کے دروازے کھل گئے۔ ایک روایت میں ہے جنت کے دروازے کھل گئے اور ارشاد فرمایا کہ قضا کو صرف دعا ہٹا دیتی ہے احتیاط اور تدبیر سے نہیں ٹلتی اور دعا۔ نازل شدہ بلا کیلیے بھی نافع ہے اور اس بلا کیلیے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور کبھی بلا نازل ہوتی ہے اور ادھر سے دعا پہنچ کر اس سے ملتی ہے اور دونوں میں قیامت تک کشتی ہوتی رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبل مصیبت بھی دعا کرتا رہے۔ اس کی برکت سے مصیبت نہیں آتی اور کبھی اس کی وجہ سے مصیبت ٹل جاتی ہے اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قدر ومنزلت کی نہیں اور جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالےٰ سختیوں کے وقت اسکی دعا قبول فرمالیا کریں۔ اسکو چاہیئے کہ خوشی اور عیش کے وقت کثرت سے دعا مانگا کرے اور ارشاد فرمایا کہ دعا مسلمان کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمان کا نور ہے۔ دُعا میں خاصیت ہے کہ اس سے تدبیر ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے۔

دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالےٰ سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ جس وقت آدمی دعا کرتا ہے۔ اس وقت غور کرکے ہر شخص دیکھ لے کہ اسکو اللہ تعالےٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا۔ بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا۔

دعا میں ایک نفع یہ ہے کہ یہ حق تعالےٰ کے یہاں معذور سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اتباع کیوں نہیں کیا تو یہ کہہ دیگا کہ میں نے طلب حق کے لیے بہت سعی کی اور آپ سے بھی عرض کر دیا کہ مجھ پر حق واضح ہو جائے، بعض دفعہ اللہ تعالےٰ اپنی رحمت وعنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا وزاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔ (شریعت وطریقت ص ۱۴۸/۱۴۹)

گر گریزی با امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست (قرآن وتصوف ص ۴۰)

دُعا کے فوائد و ثمرات

دُعا اگر بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو بڑا ہی اعلےٰ مقام ہے۔ دعا بظاہر اگر قبول بھی نہ ہو تب بھی اپنے رب سے اس بہانے مناجات اور سرگوشی کی جو نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ کیا کچھ کم سعادت ہے۔

دعا کے فوائد جلیلہ سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قلبِ انسانی کو اپنے مالک و خالق سے نسبت صحیح حاصل ہو جاتی ہے۔ اسے پتہ لگ جاتا ہے کہ ارض و سما میں مدبّر امور کون ہے۔

وہ جان جاتا ہے کہ اس کی جان کس کے قبضہ میں ہے۔ اس کا ایمان خدا، حیّ و قیوم پر کامل ہو جاتا ہے۔ اس کا اعتماد و قریب مجیب کی ہستی پر مکمل ہو جاتا ہے۔ رب العالمین کے سمع۔ بصر اور علم و قدرت کی صفات پر اس کا وثوق مستحکم ہو جاتا ہے۔ بندہ کو اپنی بیکسی بلکہ کل عالم کی درماندگی آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ عرفان ہے جس سے بندہ خود اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ معرفت جس سے اسکے سامنے کچھ کچھ شانِ الوہیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ ہزار منفعتوں کی ایک منفعت ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ بندے۔ انبیاء اور فرشتے شب و روز ذکر اور دعا اور تسبیح و استغفار کو اپنا وِرد بنائے رکھتے ہیں۔ مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنا آجائے۔ مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنے والوں کے زمرہ میں جگہ مل جائے۔ دعا کی منفعت خود لذت دُعا ہے اور یہ وہ فائدے ہیں جو آغاز کار میں عطا فرمائے جاتے ہیں۔

پھر اس دعا کے نتیجے میں مؤمن بندے کو تسکین روح اور اطمینان قلب کی جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کی برکتوں کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ (ترجمہ) سنو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان و سکون سے ہمکنار ہوتے ہیں اور سکون قلب کی وہ دولت ہے جس کے لیے بھرپور خزانوں والے سرمایہ دار اور وسیع اختیار رکھنے والے ارباب اقتدار بھی ترستے ہیں، لیکن یہ نعمت ملتی اسی کو ہے جو ایمان باللہ۔ ایمان بالآخرۃ اور حب رسول کی دولت سے مالا مال ہو۔ اللھم اجعلنا منھم۔ نیز دعا مانگنے کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ دعا مانگنے والا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے، کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اللہ تعالےٰ اس بندے سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اللہ تعالےٰ سے زیادہ مانگتا ہے۔ (ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء)

اے اللہ ہم کو اپنے در کا سوالی بنا دے اے رب کریم ہم کو مانگنا سکھلا دے

رُوح دعا

دعا کے لطف سے صحیح معنیٰ میں انسان اسی وقت آشنا ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کرلے جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

وروح الدعاء ان یری کل حول وقوۃٍ من اللہ ویصیر کالمیت فی ید الغسال وکالتمثال فی ید محرکِ التماثیل وَیجد لذۃ المناجاۃ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۵۱۔ ج ۲)

(ترجمہ) دعا کی روح یہ ہے کہ دعا کرنے والا ہر قوت و حرکت کا سرچشمہ اللہ تعالےٰ ہی کو سمجھے اور اس کی قدرت و عظمت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اس طرح بے کس اور بے بس سمجھے جیسے مردہ غسال کے ہاتھوں میں یا بے جان صورتیں۔ حرکت دینے والے کے قبضے میں ہوتی ہیں پھر اس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے مناجات اور سرگوشی کی لذت، حلاوت اسے حاصل ہوگی۔

■■

کوائف مدارسِ عربیہ

ملک کے ہر سکول کالج بلکہ کارخانے اور فیکٹری کے بھی حالات مل جاتے ہیں، لیکن دینی مراکز مدارسِ عربیہ کے بارے میں کسی قسم کی معلومات کہیں سے نہیں ملتی ہیں۔ اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مسلم اکادمی، محمد نگر۔ لاہور کی طرف سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی جا رہی ہے اس میں مغربی پاکستان کے تمام دینی مدارس کے حالات جمع کیے جا رہے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو۔ جملہ دارالعلوم اور مکاتب و مدارس کے مہتمم حضرات سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مطلوبہ کوائف جلد مہیا فرمائیں

حافظ نذر احمد جنرل سیکرٹری مسلم اکادمی

محمد نگر، علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

عازمینِ حج کے لیے

جو خوش نصیب امسال حج یا عمرہ کے لیے جا رہے ہیں، وہ ہم سے مندرجہ ذیل رسالے بلا قیمت طلب فرمائیں۔ ڈاک خرچہ کے لیے دس دس پیسے کے ٹکٹ ہر رسالہ کے لیے بھیج دیں۔

۱۔ عربی بول چال ـــــ اس کتابچہ میں ضرورت کے الفاظ، روزمرہ کی گفتگو اور عربی زبان کے ضروری جملے موجود ہیں۔

۲۔ حج و طواف کی دعائیں ـــــ جیبی سائز کے رسالہ میں تمام دعائیں معہ ترجمہ۔

۳۔ فضائل حج و عمرہ ـــــ اس موضوع پر حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کا انتخاب مع ترجمہ۔

۴۔ دوسرے رسائل بھی بشرط موجودگی

(دستی بعد دوپہر دو اور پانچ کے درمیان حاصل کریں)

مسلم اکادمی۔ نذر منزل ۲۹/۱۸ محمد نگر

علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

رُوح کیا ہے؟

شیخ الحدیث حضرۃ علامۃ مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی مدظلہم

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں

آپ نے تحریر فرمایا ہے: "رُوح کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

اس کا جواب تو یہ ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر وہ ہے جو نص قرآن سے ثابت ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ (آپ سے پوچھتے ہیں رُوح کو) جواب کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے: قل الروح من امر ربی، پس یہ مختصر جواب ہی حقیقی جواب ہے اور یہی اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ تمہارا علم بہت محدود ہے۔

اس مختصر جواب کی تفصیل یہ ہے کہ رُوح کے وجود سے انکار نہیں ہے، لیکن اس کی حقیقت کا اظہار اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ:

۱ وہ حادث ہے، اس کا حدوث امر رب سے ہوا لہٰذا وہ قدیم نہیں ہے۔

۲ اس کی پیدائش اس مادہ سے نہیں ہوئی جس سے انسان اور حیوانات یا جن وشیاطین کی پیدائش ہوئی ہے یعنی وہ مادّی نہیں ہے۔

۳ باری تعالیٰ پیدا کرنے یعنی احداث و ابداع میں مادہ کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی شان یہ ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ، (یعنی، جو چیز علم الٰہی میں تھی اس کو خطاب ہوا "کُن!" وہ درجۂ کون میں آگئی یعنی موجود ہو گئی۔

۴ اس کی دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ روح کا تعلق "عالم امر" سے ہے، "عالم امر" کی تعریف یہ کی جاتی ہے

کہ وہ عالم جو مشاہدہ سے بالا ہے، شیخ اکبرؒ نے تعریف یہ کی کہ : ماخلق اللہ بلا واسطة فهو عالم الامر وما خلق الشئ من الشئ فهو عالم الخلق فالروح من عالم الامر لكونها مخلوقة بلا واسطة بخلاف الجسم فانه من العناصر (فیض الباری صـ۵۲۶، ج-۴)

خلق سمٰوٰت کے متعلق ارشادِ ربانی ہے : ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا الخ یعنی خلق سمٰوٰت وارض کی صورت یہ ہوئی کہ صرف لفظ کن کی بنا پر ان کا خلق نہیں ہوا، بلکہ پہلے ایک دخان تھا، جس کو آج کل کی اصطلاح میں "سدیم" یا "ایتھر" کہہ سکتے ہیں۔ آسمان اور زمین کی جو صورت علم الٰہی میں تھی اس کو حکم ہوا "ائتیا" وجود میں آجاؤ، انہوں نے جواب دیا : اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ ، (ہم آئے خوشی سے)

(سورۂ دخان ع-۲)

اسی طرح انس وجن کے متعلق ارشادِ ربانی ہے : وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاءٍ مَّسْنُوْنٍ وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۔

اس طرح پیدائش روح کے لیے کسی مادہ کو کام میں نہیں لایا گیا، بلکہ براہ راست اس صورت کو جو علم الٰہی کے خزانۂ بے پایاں میں تھی حکم ہوا "کن" پس وہ وجود میں آگئی، حضرت علامہ سہیلیؒ روض الانف میں فرماتے ہیں کہ :

نسبة الملك الى الروح كنسبة البشر الى الملك فكما ان الملائكة ينظرون الينا ولا نراهم كذلك الروح ترى الملائكة ولا يرونها (فیض الباری صـ۲۲۲ ج-۱) (فرشتوں کو روح سے وہی نسبت ہے جو انسان کی فرشتوں سے ہے، جس طرح فرشتے ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ ویسے ہی روح فرشتوں کو دیکھتی ہے، فرشتے روح کو نہیں دیکھ سکتے)

حاصل یہ کہ جس طرح انسان، جن، فرشتے، علیحدہ علیحدہ مخلوق ہیں۔ ہر ایک کا عالم علیحدہ ہے۔ ایسے ہی روح بھی ایک مستقل مخلوق ہے۔ یہ مخلوق ان سب سے بالا ہے، کیونکہ بلا توسط براہ راست "امر کن" سے وجود میں آئی ہے۔

۱ انسان مادی ہے، اس کا علم مادیات تک محدود ہے، کیونکہ علم انسان کا مدار مشاہدہ پر ہے یا اس قیاس اور تجربہ پر جو مشاہدہ ہی کا نتیجہ ہوتا ہے مشاہدہ سے بالا کا علم تو کیا ہوتا ہے، وہاں تک تو پروازِ فکر بھی نہیں پہنچ سکتی، لیکن بہت سے حقائق وہ ہیں جو مشاہدہ سے وراء الوراء ہیں، جیسے خود باری تعالیٰ عزاسمہ یا مثلاً روح اور ملائک وغیرہ۔ ان سب کو قرآن

پاک "الغیب" سے تعبیر کرتا ہے اور اس پر ایمان لانا لازم گردانتا ہے۔

روح بھی ایسی ہی ایک حقیقت ہے جو "الغیب" میں داخل ہے۔ "الغیب" کی کوئی انتہا نہیں اس کی صرف وہ حقیقتیں انسان کو بتادی گئیں، جن پر انسان کی روحانی ترقی اور اخروی نجات کا مدار تھا۔ ان کے علاوہ خدا جانے کتنے حقائق یا عوالم ہیں، جن کے نام اور نشان بھی انسان کو معلوم نہیں، کیونکہ وہ اگرچہ رب العالمین کی مربوب ہیں، مگر انسان کی روحانی ترقی اور اس کی اخروی نجات سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ مادہ سے بالا تو درکنار خود مادہ ہی کے سلسلے میں خدا جانے کتنے عالم ہیں جن کا انسان کو علم نہیں، سائنس جدید نے اب کہنا شروع کیا ہے کہ نظامِ شمسی جو ہمارے تمام مشاہدات کا محور ہے ایک نہیں بلکہ خدا جانے کتنے نظام شمسی ہیں حال ہی ایک آٹھویں سیارہ کا انکشاف ہوا ہے، جس کی روشنی ہمارے آفتاب کی روشنی سے ۶ ملین (۶۰ لاکھ) زائد ہے اور اس کی کرن زمین تک ۳ ½ کروڑ برس میں پہنچے گی۔ (واللہ اعلم)

۲ حضرت حق جل مجدہ کے اسی مختصر جواب "من امر ربی" سے علماء نے اخذ کیا ہے: ھو جوھر بسیط مجرد لا یحدث الا بمحدث قولہ کن فیکون۔ (امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر ص ۶۴۳ جلد ۵)

(روح ایک بسیط و مجرد جوہر ہے، جس کا وجود و حدوث اللہ تعالیٰ کے قول "کن" سے ہوا ہے یعنی اس قول سے جو محدث ہے۔ یعنی جس کلمہ سے اللہ تعالیٰ کائنات کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے نہایت شاندار الفاظ استعمال کئے ہیں، آپ فرماتے ہیں: الروح فی الحقیقۃ حقیقہ فردانیۃ ونقطۃ نورانیۃ (حجۃ اللہ البالغہ، باب حقیقۃ الروح)

علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعریف کی: جوھر بسیط مجرد محدث بامر اللہ تعالیٰ و تکوینہ، وتاثیرہ افادۃ الحیوٰۃ للجسد (روح المعانی ص ۱۵۴ ج ۵) اور علامہ موصوفؒ نے امام فخر الدین رازی کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے: جوھر قدسی مجرد (روح المعانی ص ۱۵۲ ج ۵)

ان سب کا حاصل یہ ہوا کہ "روح" ایک جوھر یعنی ایک حقیقت واقعیہ ہے مادہ سے بالا (مجرد)، اللہ کے حکم کن سے اس کو جامۂ وجود میسر آیا، اس کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جسد (بدن انسانی) میں زندگی پیدا کر دیتی ہے۔

لیکن یہ تمام اوصاف جو روح کے بیان کیے گئے، ان کو اجزاء ماہیت نہیں کہا جا سکتا، "جوہر قدسی مجرد" کے سوا جو کچھ بیان کیا گیا وہ جزو ماہیت نہیں، بلکہ خاصیت اور خصوصیت ہے، جیسے "ضاحک" یا "بادی البشر" انسان کے لیے۔

پس مذکورہ بالا تعریف کو "حد" نہیں کہا جاسکتا، بلکہ منطقی اصطلاح میں اس کو "رسم" کہا جائے گا، "حد" (جیسے انسان کی حد حیوانِ ناطق ہے) وہ بھی نامعلوم رہی، کیونکہ اجزاء ماہیت کا علم نہیں ہوا، کیونکہ انسان میں اجزاء ماہیت کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو جو علم میسر آیا وہ قلیل ہے۔ مشاہدات سے بالا حقائق کے بیان کے لیے اس کے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ جن کا علم بھی انسان کو نہیں ہے ان کے لیے الفاظ کہاں سے آئیں گے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف نفی سے کرایا، یعنی "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" اس کے علاوہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے متعلق علم ہے کہ حیٌ۔ قیومٌ۔ علیمٌ۔ حکیمٌ قادرٌ وغیرہ یہ سب اوصاف ہیں اس کی کنہ اور حقیقت پھر بھی نامعلوم ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ علماء یہود جو امتحان لینے آئے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی جواب سے اتنے مطمئن ہوگئے کہ آپ کے ہاتھ چومے اور اپنے ایمان نہ لانے کا ایک ایسا عذر پیش کیا جو اگرچہ خود ان کا اختراع کردہ تھا، مگر بہرحال ان کے نزدیک عذر تھا کہ ہمیں یہ ہدایت ہے کہ ہم اسی نبی پر ایمان لائیں جو بنی اسرائیل میں سے ہے یا یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَآ اَنْ لَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ (آل عمران ع ۱۹) (اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ پیش کردے جس کو آگ کھا جائے۔

مقصد یہ ہے کہ علماء یہود نے اس جواب کی تردید نہیں کی، بلکہ اس جواب کو معیارِ حق، بلکہ معیارِ نبوّت سمجھا، جس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ خود انبیاء بنی اسرائیل نے روح کے متعلق یہی بتایا تھا، جو آپ نے وحی الٰہی کے بموجب بتایا۔

اس کی توجیہ آپ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ جب مذاہب کا تعلق وحی اور نبوت سے ہے ان سب کا متفقہ عقیدہ روح کے متعلق یہی ہے کہ "من امر ربی" یعنی اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ عالمِ امر کی ایک حقیقت ہے۔ یہ ہے ارشادِ ربانی کا اشارہ، اسی کو اسلام کا نقطۂ نظر کہا جاسکتا ہے۔

مشابہت روح

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "بدن انسان" میں اس روح کے علاوہ اور بھی کچھ جوہر ہیں، جو روح سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کو بھی روح کہہ دیا جاتا ہے۔

ان کی وضاحت سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے بیان سے ہوتی ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہاں اردو میں پیش کیا جارہا ہے، باب حقیقۃ الروح حجۃ اللہ البالغۃ میں آپ فرماتے ہیں:

یہ بات تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہوجاتی ہے کہ "روح" مبدأ حیات اور مدار زندگی ہے۔ نفخ روح ہوتا ہے تو زندگی شروع ہوجاتی ہے اور بدن سے اس کے جدا ہوجانے کا نام موت ہے۔ پھر دریافت حقیقت کی طرف ذہن متوجہ ہوجاتا ہے۔ تو ہمارا احساس سب سے پہلے ایک بخار لطیف (گیس یا اسٹیم) کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جو بدن انسانی کے اخلاط کا خلاصہ اور جوہر ہوتا ہے، وہ قلب میں پیدا ہوتا ہے، (سب سے پہلے رحم مادر کے اخلاط نے اس کو جنم دیا، پھر یہ انسان کی غذا کے آخری ہضم کا نتیجہ ہوتا ہے) انسان جو کچھ کھاتا پیتا ہے اس کا تدریجی ہضم پہلے اس کو خون کی شکل دیتا ہے اور خون سے یہ جوہر لطیف یا بخار لطیف پیدا ہوتا ہے، جس کو روح سمجھا جاتا ہے، یہ بدن انسانی کی اندرونی قوتوں، مثلاً قوت حساسہ، قوت مدرکہ اور قوت مدبرہ للغذاء کا حامل ہوتا ہے۔

اس بخارِ لطیف کی مختلف کیفیات کا اثر ان قوتوں پر پڑتا ہے اور ان قوتوں کی مختلف کیفیات اس بخارِ لطیف پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ قوتیں اپنا عمل صحیح طور پر نہیں کرتیں تو اس بخار لطیف کے بننے اور پیدا ہونے میں فرق آجاتا ہے۔ انتہا یہ کہ یہ بخار لطیف یا اسٹیم بجھ جاتی ہے تو شمع حیات بھی گل ہوجاتی ہے۔

بدن انسانی میں اس بخار لطیف کی مثال ایسی ہے جیسے گلاب کے پھول میں عرقِ گلاب یا جیسے لکڑی کے کوئلہ میں سلگنے والی آگ، اس روح کو "روح ہوائی" کہا جاتا ہے، اطباء کے زیر بحث یہی روح ہوتی ہے۔ (اس لیے اس کو "روح طبی" بھی کہا جاتا ہے) اس "روح طبی" کو سمجھ لینے کے بعد ایک سوال ہمارے سامنے آتا ہے، مثلاً "زید" ایک شخص ہے، کیا اس کی حقیقت کا مدار اسی روح پر ہے؟ زید بچہ تھا پھر جوان ہوا، پھر بڑھاپا اس پر چھا گیا، کبھی صحتمند رہا، کبھی بیمار پڑ گیا، بچپن میں اس کا قد صرف بیس انچ تھا، وزن پانچ پونڈ، پھر جوان ہوا تو قد سات فٹ ہوگیا اور وزن دو سو پونڈ، یہ سب تبدیلیاں ہوئیں، مگر "زید" "زید" ہی رہا، وہ پڑھتا تھا تب بھی "زید" ہی تھا، عالم فاضل ہوگیا تب بھی "زید" ہی رہا، وہ فرش زمین پر بھی "زید" ہی ہے، ہوائی جہاز پر پرواز کرتے ہوئے "زید" ہی ہے۔ اور اگر چاند پر پہنچ جائے تب بھی "زید" ہی ہے۔ اس کی شخصیت میں فرق نہیں آیا، لیکن یہ "روح طبی" یا "روح ہوائی" ایک اسٹیم ہے، غذا کے آخری ہضم کے بعد وجود میں آتی ہے اور جیسے ہی وجود میں آتی ہے ختم ہوجاتی ہے، تازہ اسٹیم اس کی جگہ لے لیتی ہے اس تسلسل سے یہ حیوانی زندگی باقی ہے، مگر اسٹیم ہر آن اور ہر لمحہ بدل رہی ہے۔

ظاہر ہے یہ ہر لمحہ بدلنے والی روح آخر عمر تک باقی رہنے والے "زید" کی شخصیت کا مدار نہیں ہوسکتی، لامحالہ یہاں کوئی اور روح ہے۔ جس پر شخصیت کا مدار ہے، لفظ "نسمہ" جو احادیث میں آیا ہے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک موقع پر فرماتے ہیں —

والذی خلق الحبۃ وبرأ النسمۃ (بخاری شریف ص۴۲۸) (قسم اس ذات کی جس نے دانے کو پیدا کیا اور نسمہ کو وجود بخشا)۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ یہ روح جس پر شخصیت "زید" کا مدار ہے، یہی "نسمہ" ہے، اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ "روح ہوائی" سے پیدا ہوا ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ "روح ہوائی" سے اس کا خاص تعلق ہے۔ پھر جس طرح "روح طبی" سارے بدن میں اسی طرح نفوذ کئے ہوئے ہے جیسے گلاب کے پھول میں عرق گلاب یا لکڑی کے کوئلہ میں سلگنے والی آگ، پورے پھول یا پورے انگارہ میں سرایت کیے ہوئے ہے، اسی طرح اس "نسمہ" کا اثر بھی پورے بدن پر ہے۔

شاہ صاحبؒ اپنی مشہور تصنیف "الطاف القدس" میں فرماتے ہیں۔

"نسمہ" ایک لطیف جسم ہوتا ہے۔ جس کو "جسم ہوائی" کہا جاتا ہے، وہ انسان کے تمام بدن میں سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے، وہ فنا نہیں ہوتا، بلکہ موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ (بحوالہ فیض الباری ص۳۳۴ ج ۳)

"حجۃ اللہ البالغۃ" میں آپ فرماتے ہیں کہ نسمہ تحلیل ہوتا ہے تو موت طاری ہوجاتی ہے، آپ فرماتے ہیں: قد تحقق عندنا بالوجدان الصحیح، ان الموت انفکاك النسمۃ عن البدن لفقد استعداد البدن لتولیدھا لا انفکاك الروح القدسی عن النسمۃ

وجدان صحیح سے یہ بات ہمارے نزدیک متحقق ہوگئی ہے کہ موت یہ ہے کہ بدن کی وہ صلاحیت جو "نسمہ" کو جنم دیتی ہے مفقود ہوجاتی ہے، جس وجہ سے "نسمہ" بدن انسانی سے جدا ہوجاتا ہے، پس بدن سے "نسمہ" کے چھوٹ جانے کا نام موت ہے۔ موت یہ نہیں ہے کہ "روح قدسی" "نسمہ" سے الگ ہوگئی۔

پھر فرماتے ہیں۔ جب مہلک امراض کے نتیجہ میں "نسمہ" تحلیل ہوجاتا ہے تو حکمت الٰہیہ اور اس کی قدرت کاملہ یہ لازم گردانتی ہے کہ "نسمہ" کا اتنا وجود ضرور باقی رہے کہ اس سے "روح الٰہی" کا تعلق باقی رہ سکے۔ جیسے کہ شیشی کو چوسا جائے تو چوس لینے کے بعد کچھ ہوا شیشی میں ضرور باقی رہتی ہے۔ یہ ہوا باقی نہ رہے تو شیشی چٹخ جائے۔ (یہی صورت "نسمہ" کی ہے)

پھر فرماتے ہیں۔ اذا مات الانسان کان للنسمۃ نشأۃ أخری، فینشئ فیض الروح الالھی فیھا قوۃ الخ (ص۱۹ حجۃ اللہ البالغۃ، باب حقیقۃ الروح)

مطلب یہ ہے کہ انسان کی موت کے بعد اس نسمہ میں ایک نئی زندگی (نشاۃ آخری) وجود پذیر ہوتی ہے اور جس مشترک کا جو

حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ "روح الٰہی" کا فیض اس میں وہ قوت پیدا کرتا ہے جو سمع، بصر اور کلام کے لیے کافی ہو سکے اور یہ عالم مثال یعنی اس قوت کی مدد سے ہوتا ہے جو مجرد اور محسوس کی درمیانی قوت ہے، جو شئ واحد کی طرح (فضاء بالا) میں پھیلی ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ بدن میں "روح طبی" کے علاوہ ایک اور جوہر ہے جو بدن انسان کی خاص صلاحیت سے وجود میں آتا ہے، موت کے وقت وہ بدن انسان سے جُدا ہو جاتا ہے، مگر فنا نہیں ہوتا، اس درجہ میں اس کا وجود ضرور باقی رہتا ہے کہ "روح الٰہی" اور "روح قدسی" سے اس کا رابطہ باقی رہ سکے۔

مرنے کے بعد "روح الٰہی" کے فیض سے "نسمہ" میں نیا نشو و نما شروع ہوتا ہے اور اس میں وہ قوت آجاتی ہے کہ بواسطۂ حس مشترک سمع، بصر اور کلام کے لیے کافی ہو سکے۔

ایک خاص قوت جو مجرد اور محسوس کی درمیانی کڑی ہوتی ہے بالائی فضا میں پھیلی ہوئی ہے اس کو عالمِ مثال کہا جاتا ہے "نسمہ" میں جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ اسی عالم مثال کا فیض ہوتا ہے۔

روح قدسی یا روح الٰہی

"نسمہ" کے بعد ایک حقیقت فردانیہ اور نقطۂ روحانیہ ہے جو ان فیوض اور افادات کے لیے جو عالم بالا سے "نسمہ" کو عطا ہوتے ہیں روشندان کا کام دیتا ہے، جس کا تعلق "نسمہ" پھر "روح طبی" کے واسطہ سے بدن انسانی سے بھی ہوتا ہے، اس کو "روح حقیقی" یا "روح قدسی" یا "روح الٰہی" کہا جاتا ہے۔ یہ روح ہے کہ قرآن حکیم اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ

استاذ محترم حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کے درس میں موقع بموقع روح، نسمہ اور نفس وغیرہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے، آپ کے یہ افادات فیض الباری کے مختلف صفحات میں منتشر ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۲۲۲ ج ۱، ص ۳ ج ۲، ص ۱۴۵ ج ۲، ص ۳۳۴ ج ۳، ص ۴۵۲ ج ۳، ص ۵۰۹ ج ۴، ص ۵۲۶ ج ۴)

آپؒ نے "نسمہ" اور "روح" کا یہ فرق بیان فرمایا کہ "نسمہ" کے متعلق ولادت کا لفظ آیا ہے، مثلاً مامن نسمۃ مولودۃ روح کے متعلق نفخ اور خلق کا لفظ آیا ہے، ولادت کا لفظ نہیں آیا، پھر فرماتے ہیں کہ نفخ کے بعد جب روح کا تعلق بدن سے ہوتا ہے تو وہ بدن کے بھی حالات اخذ کر لیتی ہے، اس اخذ و اکتساب کے سبب سے روح کے خواص میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔

پھر فرماتے ہیں: ایک ہی چیز ہے، مگر اس کے مراتب مختلف ہیں، سب سے کم درجہ وہ ہے جس کو "نسمہ" کہا جاتا ہے،

پھر تعلق بدن سے قطع نظر کر کے اس کو باری تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، تو اسی کا نام "روح" ہوتا ہے۔ (فیض الباری ج ۴ ص ۵۲۶)

مزید امتیاز کے لیے اس کو روح الٰہی یا روح قدسی کہہ دیا جاتا ہے۔)

اور یہی روح ہے کہ جب اس کا تعلق بدن سے ہوتا ہے تو اس تعلق اور نسبت سے اس کو نفس کہا جاتا ہے، جیسے مثلاً: پانی جب تک الگ ہے پانی ہے اور جب درخت اس کو جذب کر لیتا ہے تو اب اس کو پانی نہیں کہا جاتا، اور پانی کے احکام جواز وضو وغیرہ بھی اس پر نافذ نہیں ہوتے۔ (فیض الباری، ص ۱۴۵، ج - ۲)

(لیکن یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ کنوئیں کا پانی جو گلاس میں ہے اور مثلاً "تربوز" کا پانی ان دونوں کو ایک کہا جائے گا۔ یا الگ الگ تو اگرچہ "رقیق اور سیال" ہونے کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں، لیکن دوسرے اوصاف کا اتنا فرق ہے کہ ان کو ایک کہنا سراسر تکلف ہے) چنانچہ دوسرے موقع پر حضرت موصوف فرماتے ہیں: روح، نسمہ اور ذرہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک ہی حقیقت کی مختلف تفسیریں نہیں ہیں۔ نیز فرماتے ہیں: — ابن سینا نے "حیوان" کا ترجمہ "جان" اور "روح" کا ترجمہ "رواں" بتایا ہے۔ (فیض الباری ص ۳ ج - ۲) - بالفاظ دیگر ابن سینا نے "تعریفات الاشیاء" میں "نفس حیوانیہ" کا ترجمہ "رواں" اور "نفس ناطقہ" کا ترجمہ "جان" کیا ہے، پھر یہ بھی ارشاد ہے۔ اِعْلَم ان النسمة ترجمة "جان"۔

(فیض الباری، ص ۴۵۲، ج - ۳)

مستقرِ ارواح

علماء کرام کے اقوال اس مسئلہ میں بہت مختلف ہیں۔

(ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۱ تا ص ۱۶۴ ج - ۱۵)

اگر یہ کہا جائے کہ ارواح مومنین کا مستقر علیین ہے اور ارواح کفار کا مستقر سجین ہے تو سوال یہ ہے کہ علیین اور سجین کہاں ہیں۔ اس کے جوابات بھی علماء کرام نے مختلف دیئے ہیں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق اس بارے میں عجیب و غریب ہے اور غالباً سب سے نرالی ہے، حدیث معراج میں ہے کہ سماء دنیا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ علی یمینہ اسودۃ، وعلی یسارہ اسودۃ، اذا نظر قبل یمینہ ضحک، واذا نظر قبل شمالہ بکیٰ - (بخاری شریف ص ۵۰۰)

یعنی بہت سے وجود حضرت آدم کے دائیں اور بہت سے وجود آپ کے بائیں ہیں، جب آپ دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب آپکی نظر بائیں جانب مڑتی ہے تو آپ روتے ہیں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ دائیں اور بائیں ہی کو علیین اور سجین فرماتے ہیں ۔

پھر فرماتے ہیں کہ آخرت میں جہات اور سمتیں بدل جائیں گی ، فتصیر العالیۃ یمینا والسافلۃ شمالا ولا یبقی ھناک فوق، ولا تحت ۔ (فیض الباری، ص۳ ، ج ۔ ۲)

وہاں فوق اور تحت باقی نہیں رہے گا ، بلکہ فوق وہی ہوگا جو حضرت آدم علیہ السلام کے داہنے ہوگا اور تحت وہ جو بائیں ہوگا۔

پھر فرماتے ہیں واقعہ معراج چونکہ ایسے عالم میں ہوا تھا جو عالم آخرت کے مشابہ تھا اس لیے یہاں بھی فوق اور تحت کا مشاہدہ یمین اور یسار سے کرایا گیا ہے۔

پھر آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دنیا کا یہ پورا حصہ دوزخ بن جائے گا اور جنت کا حلقہ ساتویں آسمان کے اوپر سے شروع ہوگا ، قرآنِ کریم میں ہے۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (فیض الباری ص۱۸۱ ج ۔ ۴)

یعنی جنت الماوی سدرۃ المنتہی کے قریب ہے اور سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان سے اوپر ہے یا چھٹے آسمان سے شروع ہو کر ساتویں آسمان کے اوپر تک پہنچتا ہے ۔ (احادیث بخاری و مسلم شریفین)

اور اس کو منتہی اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ عالم بالا اور عالم سافل کے انتہا پر ہے ، زمین سے صعود کرنے والی چیزیں یہاں تک پہنچ سکتی ہیں ، آگے نہیں جا سکتیں ، حتیٰ کہ فرشتے بھی آگے نہیں جا سکتے ، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلے بسوزد پرم

سدرۃ المنتہی سے بالاکمل طور پر الغیب ہے ۔ فرشتوں کو بھی اس کا پتہ نہیں ۔ (روح المعانی وغیرہ)

علی ہذا عالم بالا سے نزول کرنے والی چیزیں پہلے یہاں پہنچتی ہیں ۔ (روح المعانی و تفسیر مظہری وغیرہ)

اس توجیہہ کی بنا پر ارواح طیبہ کا مستقر ساتویں آسمان سے اوپر ہوگا اور ارواح خبیثہ کا مستقر سجین ہوگا جو تحت الارض تک پہنچتا ہے۔

لیکن علامہ ابن قیمؒ "کتاب الروح" میں فرماتے ہیں کہ اس عالم میں جو قیامت سے پہلے ہے جس کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے ارواح کا کوئی مستقر نہیں ہے ، وہ جہاں چاہیں جا سکتی ہیں اور وہ اپنے خاص مستقر پر حساب کتاب کے بعد پہنچیں گی ۔

(فیض الباری ، ص۱۸۱ ، ج ۔ ۴)

لیکن یہاں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ "نسمہ" جو موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کا مستقر کیا ہے؟ اس سلسلے میں کسی عالم کی کوئی تحریر احقر کے حقیر مطالعہ میں نہیں آئی، البتہ ایک مرتبہ جب احقر نے حضرت علامہ کشمیریؒ سے دریافت کیا تھا کہ آجکل جو ایک فن ایجاد ہوا ہے کہ ارواح کو بلا کر ان سے بات کی جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ تو حضرت علامہؒ نے اس کے جواب میں ایک مفصل تقریر فرمائی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ عالمِ برزخ کا محل بھی یہی سماء و ارض کا علاقہ ہے، یہ روحیں اسی عالم میں ہیں۔

حضرت استاذ سے احقر نے دریافت بھی نہیں کیا اور آپ نے تصریح بھی نہیں فرمائی، مگر احقر کا گمان ہے کہ حضرتؒ کے پیشِ نظر ارواح قدسیہ نہیں بلکہ یہ نسمات ہی تھے، یہ نسمہ باقی رہتا ہے اور علامہ ابن قیمؒ کی تحریر کے بموجب عذاب و ثواب اس کے ساتھ ہی لگا رہتا ہے، وہ اسی میں مبتلا گھومتا پھرتا ہے ـــــ حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال پاگل کتے سے دی ہے کہ اس کا شدید مرض ساتھ لگا ہوا ہے اور وہ گھومتا پھرتا ہے۔ دوسروں کو گزند بھی پہنچاتا ہے، ارواح خبیثہ کی مثال یہی ہے۔ مگر ارواح طیبہ ایسی حرکتوں سے بالا رہتی ہیں اور ان کو وہ راحت و سرور حاصل رہتا ہے جس کی پوری حقیقت آخرت میں ان کے سامنے آئے گی۔ اس کے اثرات یہاں ان کو عالم برزخ میں پہنچتے رہتے ہیں۔

بہر حال احقر کی ناقص رائے یہی ہے کہ عالم برزخ میں رہنے والا نسمہ ہے اور روح کا مستقر عالم بالا ہے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ارواح انبیاء کا مستقر اعلیٰ علیین، ارواح شہداء کا مستقر جنت کے وہ قندیل ہیں جو عرش میں آویزاں ہیں اور عام مومنین کا مستقرِ ارواح جنت ہے۔ (روح المعانی ص۱۶۱ ج ۱۵) واللہ اعلم بالصواب)

اور ارواح یعنی نسمات کو بلانا اور ان سے گفتگو کرنا، کوئی نئی بات نہیں ہے، عامل حضرات کے یہاں ارواح کو بلانے اور ان سے بات کرنے کا عمل بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔

اہلِ یورپ نے بلانے کے طریقے اپنے طور پر ایجاد کیے ہیں، عامل حضرات سورۂ مزمل وغیرہ پڑھ کر روح کو حاضر کیا کرتے ہیں اس عمل کو عامل حضرات کی اصطلاح میں حاضرات کہا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نفس تحریر بالا میں "روح ہوائی"۔ "نسمہ"۔ "ذرہ" اور "روح" کا تذکرہ آگیا، مگر نفس کے متعلق حضرت علامہ کشمیریؒ کی ایک تقریر میں مختصر تذکرہ آیا اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی تحریر میں مختصر تذکرہ بھی نہیں ہے حالانکہ قرآن شریف میں نفس کا تذکرہ بہت جگہ ہے اور بڑی اہمیت کے ساتھ ہے۔ مثلاً مَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (پارہ ۱۳۔ سورۂ یوسف) نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (سورۂ نازعات) یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (الفجر)

تو اس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ نفس الگ چیز نہیں، بلکہ بقول حضرت علامہ کشمیریؒ روح کا نام ہی نفس ہے. جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ روح کا تعلق جب بدن سے ہوتا ہے تو اس تعلق کے لحاظ سے اس کو نفس کہا جاتا ہے۔ ابن قیمؒ بھی اسی کے قائل ہیں اور حضرات صوفیا بھی۔

اب اس تعلق کی بنا پر یہی ایک الگ سی چیز بن جاتا ہے، یعنی وہ شان باقی نہیں رہتی جو روح مجرد کی ہے (حقیقت فردانیہ و نقطۂ روحانیہ) بلکہ ثم رددناہ اسفل سافلینؒ کی صورت ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے تہذیب اور تزکیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور تہذیب تزکیہ کے لحاظ سے نفس کے چار درجے ہوتے ہیں۔

(۱) تہذیب الظاہر، یعنی صوم وصلوٰۃ وغیرہ فرائض اور احکام شریعت کی پابندی سے اس کا ظاہر مہذب اور مزکی ہو جائے۔

(۲) تہذیب الباطن کہ ملکات رذیہ، اور اخلاق ذمیہ ختم ہو جائیں اور مکارم اخلاق ملکہ اور ذاتی جذبہ بن جائیں۔

(۳) تحلی النفس بالصورۃ القدسیۃ۔

(۴) فناہا عن ذاتہا، بملاحظۃ جلال رب العالمین جل جلالہ۔

۳ و ۴ کی تفصیل طویل ہے ہمارے موضوع سے بھی خارج ہے، اس کے لیے کتب تصوف کے مطالعہ کی ضرورت ہے، روح المعانی میں بھی اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، مگر وہ خلاصہ بھی طویل تشریح کا محتاج ہے۔

اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا وہ بھی کافی طویل ہو گیا۔ والعلم الصحیح عند اللہ عالم الغیب والشہادۃ۔

تربت پہ انکی رحمت رب کریم ہو

رخصت ہوئے جہاں سے محمد رسول خانؒ — عالم تھے، باعمل تھے عجب مردِ خوش خصال
منقول میں امام زماں ان کی ذات تھی — بخشا خدائے پاک نے ایسا انہیں کمال
عمرِ طویل ساتھ تھی خیر کثیر کے — وہ اہلِ علم میں آپ ہی تھے اپنی ایک مثال
اشرف علیؒ کی نسبتِ باطن کے تھے امیں — اخلاق میں تھا پرتوِ محبوب ذوالجلال
رمضان کے دنوں میں گئے سوئے آخرت — مجد و شرف کے ساتھ ملی نعمتِ وصال
تربت پہ ان کی رحمتِ رب کریم ہو — رحمت تری ہو دائمی اے رب ذوالجلال

(محمود احمد عارف)

آمین

درسِ حدیث

حسنت جمیع خصالہٗ

مخدوم و محترم حضرۃ مولانا الحاج سیّد حامد میاں مدظلہم

۱۔ وعنہ (ای عن انسؓ) قَالَ لَمْ یَکُنْ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَاحِشًا وَّلَا لَعَّانًا وَّلَا سَبَّابًا کَانَ یَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتَبَۃِ مَالَہٗ تَرِبَ جَبِیْنُہٗ (رواہ البخاری)

۲۔ وعن انس ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ اِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ یَنْزِعْ یَدَہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِیْ یَنْزِعُ یَدَہٗ وَلَا یَصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَجْھِہٖ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِیْ یَصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَجْھِہٖ وَلَمْ یُرَ مُقَدِّمًا رُکْبَتَیْہِ بَیْنَ یَدَیْ جَلِیْسٍ لَّہٗ (رواہ الترمذی مشکوٰۃ)

۱۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ فحش گو تھے نہ لعن وطعن کی عادت تھی۔ جب خفا ہوتے تھے تو عربی کا ایک محاورہ استعمال فرمایا کرتے تھے (جس کا ترجمہ ہے) اسے کیا ہوا؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

۲۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مصافحہ فرمایا کرتے تھے تو اپنا دستِ مبارک اس کے ہاتھ میں سے نہ نکالتے تھے حتّٰی کہ وہ ہی اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دے اور نکالے۔ اور کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ آپ اپنے ساتھی کے آگے اپنے گھٹنے بڑھا رکھے ہوں۔

جناب آقائے نامدار علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو حق تعالےٰ نے کامل ترین صفات پر پیدا فرمایا تھا۔ طرح طرح کے کمالات وفضائل آپ کی ذاتِ گرامی میں ودیعت فرمائے تھے۔ آپؐ کو ظاہر اور باطن دونوں میں اس درجہ بلندی عنایت فرمائی تھی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ظاہری اور محسوس ومشاہد صفات کا اندازہ تو حضرت جابرؓ کی اس روایت سے فرمالیں کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لَمْ یَسْلُکْ طَرِیْقًا فَیَتْبَعُہٗ اَحَدٌ اِلَّا عَرَفَ اَنَّہٗ قَدْ سَلَکَہٗ مِنْ طِیْبِ عَرَقِہٖ اَوْ قَالَ مِنْ رِیْحِ عَرَقِہٖ۔ یعنی سرورِ کائنات (صلی اللہ

علیہ وسلم) جس راستے سے گزر جاتے تھے بعد میں کوئی اس راستہ پر چلتا تو یہ ضرور معلوم کر لیتا کہ آپ کا ادھر سے گزر ہوا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو جو ایک خاص قسم کی مہک عطا فرمائی تھی وہ محسوس ہوتی تھی۔ یعنی اس راستہ میں خوشبو مہکتی جس سے آپ تشریف لے جاتے۔

اسی طرح آپ کے پسینہ میں بھی اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہوتی تھی۔ ایک صحابیہ حضرت انسؓ کی والدہ حضرت اُمِ سلیم (جو آنحضرتؐ کی ننھیالی رشتہ داروں میں سے تھیں اور آپؐ ازراہِ بے تکلفی کبھی کبھار دوپہر کو ان کے گھر آرام فرما لیتے) فرماتی ہیں کہ آپؐ ہمارے ہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ آپؐ کو پسینہ بکثرت آتا تھا۔ میں اسے (کسی ترکیب و طریقہ سے) جمع کر لیا کرتی تھی اور اسے خوشبو میں ملا دیتی تھی۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دریافت فرمایا کہ یَا اُمَّ سُلَیْمٍ مَا ھٰذَا ؟ اُمِ سلیم ! یہ کیا ہے ؟ جواب دیا۔ عَرَقُکَ نَجْعَلُہٗ فِیْ طِیْبِنَا وَھُوَ مِنْ اَطْیَبِ الطِّیْبِ ۔ یعنی یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اسے خوشبو میں ملائیں گے اور یہ خود بھی عمدہ ترین خوشبو ہے — ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت اُمِ سلیم نے فرمایا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ نَرْجُوْ بَرَکَتَہٗ لِصِبْیَانِنَا ۔ کہ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کی برکت سے ہمارے بچوں کو فائدہ پہنچے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا — اَصَبْتِ — یعنی ٹھیک کیا۔

تو آپ کو ظاہری کمالات بھی اس قدر عنایت ہوئے کہ ان کا احصار مشکل ہے۔ ایک صحابی آپؐ کے حُسن کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں رَاَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ لَیْلَۃٍ اُضْحِیَانٍ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ وَاِلَی الْقَمَرِ وَعَلَیْہِ حُلَّۃٌ حَمْرَاءُ فَاِذَا ھُوَ اَحْسَنُ عِنْدِیْ مِنَ الْقَمَرِ ۔ یعنی میں نے ایک دفعہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو چاندنی رات میں دیکھا۔ میں ایک نظر آقائے نامدار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھتا تھا اور ایک نظر چاند پر ڈالتا تھا تو میں نے یہ دیکھا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مَا رَاَیْتُ شَیْئًا احسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان الشمس تجری فی وَجْہِہٖ ۔ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین کوئی نہیں دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے چہرۂ انور میں سورج چل رہا ہو۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے جو انہوں نے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی منقبت میں کہے ہیں۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

وَاَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِي
وَاَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

یعنی کبھی اور کہیں میری آنکھ نے آپؐ سے زیادہ حُسن والا نہیں دیکھا اور آپؐ سے زیادہ جمال والا عورتوں نے پیدا ہی نہیں کیا۔

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

آپ ہر عیب سے پاک کیے گئے ہیں گویا کہ آپؐ ایسے پیدا فرمائے گئے ہیں کہ جیسا آپؐ چاہتے تھے۔

یہ تو ہوا آپؐ کے ظاہری حُسن اور ظاہری کمالات کا بیان۔ رہا آپ کی سیرتِ طیبہ کا معاملہ تو یہ بیان سے باہر کی بات ہے۔

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ

آپ غایت درجہ پاکیزہ عادات کے حامل تھے۔ آپؐ کی طرح پاکیزہ عادات وخصائل اور کسی کو عنایت نہیں کی گئیں۔ آپ کو زندگی میں جس جس سے واسطہ پڑا ہے وہ آپؐ کے بلند اخلاق اور بہترین صفات سے ضرور متأثر ہوا ہے۔ آپؐ نے ہر شخص کے ساتھ اس کے شایانِ شان نہیں، بلکہ اپنی شایانِ شان برتاؤ فرمایا ہے۔ ہر دور میں ہر شخص کو آپؐ نے خوش رکھا۔ (کفار وحاسدین کی بات الگ ہے) زندگی میں سب سے پہلے والدین یا ان کے قائم مقام سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ تو بچپن ہی میں وفات پا گئی تھیں؛ البتہ آپؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے آپؐ کو دودھ پلایا تھا حیات تھیں۔ آپؐ ان کی بہت تعظیم فرماتے، بہت محبت اور انتہائی عزت سے پیش آتے، بڑی قدر فرماتے۔

اسی طرح جب آپؐ اپنے والد و دادا کی وفات کے بعد اپنے چچا ابوطالب کے گھر پرورش پا رہے تھے تو اس دوران باوجودیکہ آپؐ کا بچپن تھا ابوطالب یا گھر کے دوسرے افراد کو کبھی شکایت پیش نہیں آئی۔ چچا بھی

خوش تھے، چچی بھی خوش تھیں۔ چچازاد بھائی (حضرت علیؓ و جعفر طیار) بھی خوش تھے۔ پورا گھرانہ آپؐ کی پاکیزہ خصلتوں کے باعث آپؐ سے خوش تھا۔ آپؐ میں عام لڑکوں کی طرح جھگڑے لڑائی اور دوسرے عیوب کا نام تک نہ تھا۔ آپؐ کی ذات میں سراسر شائستگی اور اچھائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت جعفر طیار بہت جلدی آپؐ پر ایمان لے آئے کیونکہ بچپن سے آپؐ کی پاکیزہ سیرت سے متاثر تھے۔ خود ابوطالب بھی آپؐ کے بہت مداح تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی شان میں قصائد لکھے جو حافظ ابن کثیرؒ نے بالتفصیل دیے ہیں۔ گویا جہاں رہے ہیں، جس کے پاس رہے ہیں وہ آپؐ کی تعریف و توصیف ہی کرتا رہا ہے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ فرماتی ہیں کہ دودھ پینے کے زمانے میں آپؐ کی یہ عادت تھی کہ آپؐ ایک پستان کا دودھ پیتے دوسرا پستان اپنے رضاعی بھائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس وقت بھی قلب اطہر میں وہ بات ڈال دی تھی جو عین انصاف کے مطابق تھی۔ بچپن اور لڑکپن کے بعد جب ایک اور دور آیا، جس میں شرم و حیا، عقلمندی و ذہانت وغیرہ صفات کا اندازہ ہوتا ہے تو اس دور میں بھی آپؐ ہر صفت میں ممتاز رہے۔ آپؐ جیسا شرم و حیا والا انسان اور کوئی نہیں تھا۔ آپؐ سب سے زیادہ باشرم و باحیا تھے۔ زندگی بھر ایسا کوئی فعل سرزد نہیں ہوا جو شرم و حیا کے خلاف ہو۔ ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت عباس کے اصرار پر قدرے بے پردگی ہو گئی تھی۔ آپؐ فوراً ہی نیم بے ہوش ہو گئے۔ حتیٰ کہ ستر ڈھانپا گیا۔ عقلمندی و ذہانت میں بھی آپؐ بے نظیر و بے مثال تھے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ عقلمند تھے۔ آپؐ کی ذہانت و عقلمندی کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لیجئے کہ ایک دفعہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کے موقع پر جھگڑا پیدا ہو گیا کہ حجرِ اسود کو کون نصب کرے گا۔ ہر قبیلہ والوں کی یہ خواہش تھی کہ یہ اعزاز انہیں ملے۔ کافی لے دے کے بعد چند شرائط مقرر کیں کہ جو شخص ان شرائط پر پورا اترے گا وہی حجرِ اسود کو نصب کرے گا؛ چنانچہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی مقرر کردہ شرائط پر پورے اترے۔ اس لیے حجرِ اسود کو نصب کرنا آپؐ کے ذمہ ٹھہرا۔ آپؐ اس حجرِ اسود کو اپنے دستِ پاک سے اٹھا کر بھی نصب کر سکتے تھے، مگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ آپؐ نے ایک چادر میں وہ سنگِ اسود رکھا اور پھر سب سے وہ چادر پکڑوائی اور سب مل کر وہ حجرِ اسود جائے نصب تک لے گئے۔ آپؐ کی اس تدبیر سے جو جنگ و جدال کے بادل منڈلا رہے تھے چھٹ گئے۔ اس طرح سے تمام قبیلے والوں کو حجرِ اسود نصب کرنے کا اعزاز ملا۔ آپؐ کی اس تدبیر سے سب خوش ہوئے اور سب نے

آپ کی ذہانت و عقلمندی کی تعریف کی — تو دوسری صفات و کمالات کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت درجہ عقلمندی و ذہانت بھی مسلّم تھی۔ آپؐ بہترین صفات کے مرقع تھے۔ آپؐ کی ذات میں حسنات ہی حسنات تھیں۔ لڑکپن سے آخرت تک جملہ عادات نیک اور پاکیزہ تھیں۔

ایک مرتبہ آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک پہاڑی کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ یہاں یہ لوگ پہلے بھی پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ اس پہاڑی پر ایک راہب رہا کرتا تھا، لیکن وہ اپنے گرجے سے کبھی نہ نکلا کرتا تھا۔ اس دفعہ وہ خود بخود اس قافلے کے پاس اتر کر آیا اور آپؐ کی وجہ سے تمام قافلہ والوں کی دعوت کی۔ سب کو ایک درخت کے نیچے بٹھلایا۔ آپؐ اس وقت کسی کام پر تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے تو سایہ میں جگہ نہ پائی، اس لیے دھوپ ہی میں بیٹھ گئے۔ گویا جہاں جگہ ملی وہیں تشریف فرما ہوئے۔ جب آپؐ دھوپ میں بیٹھے تو درخت کا سایہ آپؐ پر آگیا۔ راہب نے بھی دیکھا کہ سایہ آپ کی طرف آگیا، اسلیے ابوطالب سے کہا کہ آپ انکے سرپرست ہیں، آپ انہیں آگے سفر میں ساتھ نہ رکھیں، بلکہ واپس بھیج دیں اور ان کا خیال رکھا کریں، یہ نبی ہیں۔ بعض دوسری قوموں کے لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف شر اور دشمنی ہوگی۔ کہیں وہ کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کو تمام درختوں اور پتھروں نے سجدہ کیا ہے اور یہ نبی ہی کو سجدہ کیا کرتے ہیں؛ چنانچہ ابوطالب نے اس راہب کی بات مان لی اور آپؐ کو وطن واپس بھیج دیا۔

ہر شخص آپؐ کی فضیلت اور برتری کا معترف تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؐ کی خوبیاں اور حسنات دیکھ کر آپ کی بیوی بنیں اور آخر تک آپؐ کی خوبیوں کی معترف رہیں۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت خدیجہؓ آپؐ کی خوبیاں اس طرح بیان فرماتی ہیں کہ آپؐ ناداروں کی امداد فرماتے ہیں، پڑوسیوں کے حقوق کی نگہداشت کرتے ہیں، بڑوں کا احترام فرماتے ہیں، چھوٹوں پر شفقت فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو پوری کائنات پر برتری بخشی تھی۔ خدا کی تمام مخلوق میں کوئی آپؐ کا ہمسر نہیں۔ آپؐ ہر حیثیت سے بالاتر ہیں۔ مذکورہ بالا دو حدیثوں میں جو مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ بخاری شریف اور ترمذی شریف مذکور ہیں آپؐ کی ان عاداتِ مبارکہ کا ذکر ہے جن کا تعلّق بندوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ معاملہ سے ہے۔ اسکا نام اخلاق ہے اور قرآنِ کریم میں ارشاد ہے اِنَّکَ لعلیٰ خُلُقٍ عظیم یقیناً آپ بڑے اور بلند اخلاق پر پیدا فرمائے گئے ہیں۔

قمر عثمانی

طلبۂ علومِ دینیہ سے خطاب

حضورِ سیّدِ خیر الوریٰ کے میہماں ہو تم
کتاب اللہ و سُنت کے حقیقی ترجماں ہو تم

اصُولِ دینِ فطرت کے حقیقی رازداں ہو تم
خزاں نادیدہ گلشن کی بہارِ جاوداں ہو تم

تمہارے دم سے قائم ہے جہاں میں سطوتِ دینی
متاعِ کفر کے حق میں بلائے ناگہاں ہو تم

تمہارے ذکر سے ایوانِ شیطانی میں ہلچل ہے
جہاں میں شوکتِ اسلام کا محکم نشاں ہو تم

وہی گلشن اکابر نے جسے خوں دیکے سینچا ہے
بہاریں اسکی تم سے ہیں اور اسکے باغباں ہو تم

حوادث کی جبینِ پُرشکن سے تم نہ گھبراؤ
تمہیں کیا خوفِ طوفاں کا کہ بحرِ بیکراں ہو تم

اُٹھو اور قوتِ اخلاق سے دُنیا پہ چھا جاؤ
مقدس محترم تاریخ کی اک داستاں ہو تم

زمانہ کو دکھا دو راستہ تقوے کی منزل کا
کہ رخشندہ روایاتِ کہن کے پاسباں ہو تم

دَورِ حاضِر کے
سیاسی اور اقتصادی مَسائِل
اور
اِسلامی تعلیمات و اشارات

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد مُحمّد میاں دامت برکاتہم

قومی مصارف اور ذرائع آمدنی

کتاب اللہ کے اشارات

قرآنِ حکیم کا یہ کمال ہے کہ اس نے جہاں صرف (خرچ) کا کوئی مد بیان کیا ہے تو ساتھ ہی اس کی آمدنی کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں :-

نیکی

(۱) دنیا کے ہر ایک مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو نیک بنانا چاہتا ہے۔ قرآنِ حکیم نیکی کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ مالی نظام کے اس حصہ کو جو فرد کی معیشت اور معاشرت سے تعلق رکھتا ہے اس کو بھی وہ نیکی کا ضروری باب گردانتا ہے کہ جب تک اس پر عمل نہ ہو لفظِ "نیکی" بے معنی ہے اور کوئی فرد خواہ کتنا عبادت گزار، کتنا ہی شب بیدار ہو، مسلسل روزوں پر روزے رکھتا ہو، رات دن تسبیح جپتا ہو، جب تک نیکی کے اس باب کو عمل میں نہیں لائے گا، وہ صالح اور نیک نہیں ہو گا۔

سُورۃ بقرہ۔ آیت ۱۷۷ کا خلاصہ یہ ہے :-

" نیکی اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لو یا پچھم کی طرف (اور ظاہری رسوم کی پابندی کرو)۔ نیکی یہ ہے کہ اپنی اصلاح اور شخصیّت کی تعمیر اس طرح کرو :-

(الف) اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، خدا کے تمام نبیوں پر تمہارا ایمان ہو (عقیدہ صحیح ہو جو بنیادی شرط ہے)

(ب) اور اس وقت جب کہ (اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریتیں موجود ہوں، ان کی ذمّہ داریاں تم پر لازم ہوں جن کے پورا کرنے کے لئے خود تمہیں) مال محبوب ہو۔ تم یہ محبوب مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں کی امداد، سائلوں کا سوال پورا کرنے اور گردنوں کو چھڑانے میں خرچ کرو۔

(ج) پورے آداب وشرائط کے ساتھ نماز قائم کرو۔

(د) زکوٰۃ ادا کرو۔

(ر) اپنی بات کے پکے رہو۔ جب قول وقرار کر لو تو اس کو پورا کرو۔

(ہ) اور تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف وہراس کا وقت، ہر حال میں صبر (ضبط وتحمّل اور استقلال) سے کام لو۔ یہی ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہیں اور یہی ہیں متقی اور پرہیزگار۔

اس آیت میں خرچ کی دو مدّیں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) ضرورت مندوں کی امداد، وہ بالغ ہوں یا نابالغ (یتیم) رشتہ دار ہوں یا اجنبی، مسافر (وطن یا غیر وطن کے) یا سائل۔

(۲) گردن چھڑانا یعنی غلام آزاد کرنا۔ یا مقروض کا قرض ادا کرنا۔

خرچ کی طرح آمدنی کے بھی دو مدیں بیان فرمائے گئے ہیں۔ (۱) زکوٰۃ (۲) عطیہ۔ زکوٰۃ کی رقم ضرورت مندوں پر خرچ کی جائے گی۔ البتہ ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ زکوٰۃ دینے والے پر واجب ہو جاتا ہے۔ (مثلاً اولاد، یا ماں باپ) ان کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جائے گی۔ میاں، بیوی بھی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ (مفتی بہ)

زکوٰۃ کی رقم کسی تبادلہ میں نہیں دی جاسکتی۔ لہٰذا آزاد کرنے کے لئے جو غلام خریدا جائے گا۔ اس کی قیمت اپنے پاس سے دینی ہوگی۔ جس کو ہم نے عطیہ کہا ہے۔ البتہ اس سے اسلام کا مزاج معلوم ہوگیا۔ اس کی نظر میں گردن چھڑانے کو وہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کو نیکی کے مفہوم میں داخل اور خرچ کی ضروری

مدآت میں شامل کیا گیا ہے۔ ان مدات کے لئے ضروری نہیں ہے کہ نظام حکومت کو واسطہ بنایا جائے۔ اگر مسلمانوں کی حکومت نہ ہو یا مسلمانوں کی حکومت مطالبہ نہ کرے۔ تب بھی نیک کردار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان مدات پر خرچ کیا جائے۔ یعنی جس طرح نماز روزہ یا خود اپنے اہل وعیال کا نفقہ ہر مسلمان پر ہر حال میں فرض ہے۔ خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت زندگی گزارتا ہو۔ ایسے ہی خرچ کے یہ مدات بھی مسلمان کے لئے لازمی فرائض میں داخل ہیں۔

دوسری ضرورتیں اور مداتِ آمدنی

غریبوں کا پیٹ بھر دینے ضرورت مندوں کی ذاتی اور شخصی ضرورتیں پوری کر دینے، غلاموں کی گردن چھڑا دینے یا مقروضوں کا قرض ادا کرنے سے ترقی پذیر قوم وملّت کی تمام ضرورتیں پوری نہیں ہوجاتیں۔

امتِ اسلامیہ جس کا فرض منصبی یہ ہے کہ (حق وصداقت کی علمبردار بن کر پوری دنیا کو اس حقیقت کا مشاہدہ کرائے کہ وہ دستور اساسی اور کانسٹی ٹیوشن یا ملینی فسٹو جس کو کلمۃ اللہ کہنا چاہیے، صرف اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ سب سے بلند وبالا رہے) وہ اپنے اس نصب العین میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جب تک روحانی عظمت و احترام، اخلاقی اقتدار و برتری کے ساتھ مادی ترقیات میں بھی اس کا قدم سب سے آگے اور اتنا آگے نہ ہو کہ دوسرے قدم وہاں تک پہنچتے پہنچتے تھک جائیں۔

افراد کی ہیئتِ اجتماعی کا نام ملت ہے۔ یہ ہیئتِ اجتماعی ترقی کی قطب مینار پر اسی وقت پہنچ سکتی ہے۔ جب کہ اس کے افراد کی غالب اکثریت ترقی کے تمام زینے طے کر چکی ہو۔

اگر مسلمان ارشادِ ربانی (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ) کے مضمرات کو اپنا جذبۂ عمل بنالیں، تو لامحالہ ان کی تعلیم کا میدان دوسرے قوموں کی تعلیمی میدانوں سے بہت زیادہ وسیع ہوگا اور اس بنا پر ان کے تعلیمی مصارف بھی دوسری قوموں کے مقابلہ پر بہت زیادہ ہوں گے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے صرف وہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں کافی نہیں ہوں گی جن میں عصری تعلیم سائنس کیمسٹری، فلسفہ، طبعیات، فلکیات یا ڈیفنس اور دفاعی وجنگی فنون کی تعلیم دی جاتی ہو اور ان کا ماہر بنایا جاتا ہو بلکہ ان کو ایسی درسگاہوں، تربیت گاہوں اور ایسے دارالعلوموں کی بھی ضرورت اور اتنی ہی شدید اور بنیادی

ضرورت ہوگی۔ جہاں مذہبی تعلیم اور اخلاق اور روحانیت کی تربیت اور تکمیل ہو سکے۔ تاکہ مسلمان نوجوانوں کا طبقہ جس طرح عصری علوم اور فنونِ جدیدہ کا ماہر ہو، وہ خدا شناسی، حقیقت شناسی، اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا بھی ایسا کامل نمونہ ہو کہ وہ "شہداء علی الناس" بن سکے اور خداوند عالم کی حجت پوری ہو سکے۔

بالفاظِ دیگر اگر کمیونسٹ روس کے بجٹ کا ساٹھ فیصدی تعلیم پر صرف ہوتا ہے، تو خلافتِ اسلامیہ کو اپنے بجٹ کا اسی فیصدی تعلیم کے لئے مخصوص کرنا پڑے گا۔ تاکہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی ہو سکے۔ اور دنیا امام غزالی ابن رشد اور رازی جیسے ائمۂ علوم و فنون کے فیوض و برکات سے بہرہ یاب ہو سکے۔

یہ کتنی رقم ہوگی، کہاں سے فراہم ہوگی۔ قرآنِ حکیم اس کا جواب دینے سے پہلے یہ تحقیق کرتا ہے کہ یہ ضرورت کس کی ہے۔ ضرورت مند کون ہے۔

تعلیم و تربیت اور ترقی، فرد کی ضرورت ہے یا اللہ تعالیٰ کی؟ بعنوانِ دیگر فرد کی ضرورت ہے یا حکومت کی، اپنی اور اپنی اولاد کی ترقی کی ضرورت بڑے سے بڑے دولت مند امیر کبیر کو بھی ایسی ہے جیسے معمولی آدمی کو۔ اس ضرورت کے لحاظ سے امیر کبیر اور بڑے سے بڑا دولت مند بھی حاجت مند اور قرآن حکیم کے الفاظ میں فقیر ہے۔

تعلیمی ضرورتوں کے علاوہ اور بھی ضرورتیں ہیں جن کا تعلق پوری قوم کی تعمیر و ترقی سے ہے۔ مثلاً سڑکیں نہریں۔ پل۔ مسافر خانے اور ترقی پذیر ذرائع مواصلات و مراسلات (ڈاک تار بحری اور ہوائی سروسیں وغیرہ) مگر یہ تمام ضرورتیں خود قوم کی ضرورتیں ہیں۔ خدا کی ضرورتیں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ وہ ان مدات پر خرچ کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور ان تمام رقوم کو جو ان مدات کے لیے عطا کی جائیں۔ اپنے ذمہ قرض مان لیتا ہے اور اس مدد کو خود اپنی مدد قرار دیتا ہے اور بڑی پختگی سے وعدہ فرماتا ہے۔

ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (سورہ حج۔ آیت ۴)

"یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ قوت رکھنے والا سب پر غالب ہے"

ان وسیع اور ہمہ گیر ضرورتوں کو سامنے رکھیئے۔ پھر سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری آیتوں کا مطالعہ کیجئے۔ ان آیتوں کے مفہوم اور منشاء پر غور کرتے ہوئے جیسے جیسے صرف کی مدات آپ کے سامنے آئیں گی۔ مدات کی آمد کا سراغ بھی مل جائے گا۔

آیات کا مضمون یہ ہے (اللہ تعالیٰ اہل ثروت کو خطاب فرما رہے ہیں۔)

دیکھو دیکھو، تم ہی کو خاص تم ہی کو دعوت دی جا رہی ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرو، پھر تم میں سے کچھ وہ ہیں جو (خرچ نہیں کرتے) بخل کرتے ہیں یاد رکھو جو بخل کرتا ہے وہ خدا سے نہیں خود اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو کوئی ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے (یہ تعلیمی تعمیری ترقیاتی اور دفاعی ضرورتیں خود تمہاری ضرورتیں ہیں جن کی بنا پر تم اگر دولت مند ہو تب بھی)

فقیر اور حاجت مند ہو۔ اس حقیقت کو سمجھو اور پورے حوصلہ سے خرچ کرو (اور اگر خرچ سے) منہ موڑتے ہو (تو یقین رکھو تباہی اور بربادی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ مگر برباد تم خود ہو گے۔ خداوندِ عالم کی ذات باقی اور بے نیاز ہے اسے کبھی کوئی زوال نہیں آسکتا؛ تم فنا ہو جاؤ گے) تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو تمہارا بدل کر دے گا۔ وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ (سورہ محمد آیت ۳۸)

تناسب سالانہ بچت کا ڈھائی فیصدی جس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ فقیروں، یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا مخصوص حصہ ہے۔ اس میں سے ان تعمیری اور تعلیمی مدات پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ ان مدات کے لئے اصحابِ حیثیت کو اور رقم فراہم کرنی ہوگی۔ اس کا تناسب کیا ہو یہ تناسب ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے خود اہلِ ثروت طے کریں یا وہ معتمد یا اہل الرائے طے کریں جو عہد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے عرفا کی طرح اپنے قبیلے یا اپنی آبادی کی نمائندگی کرتے ہوں۔ خرچ کرنے والوں اور بخل کرنے والوں کو قید و بند اور ضبطی جائیداد جیسی کسی قانونی سزا کی دھمکی نہیں دی گئی۔ البتہ نتیجے سے آگاہ کر دیا گیا ہے وہی دھمکی ہے۔ تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ بخل کا نتیجہ خود ان کے اپنے حق میں بخل ہو گا۔ اس سے زیادہ بخل کیا ہو سکتا ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل خراب کرلے اور چند ٹکے بچانے کی خاطر عام تباہی اور بربادی مول لے لے۔

یہی تنبیہہ اور آگاہی دوسرے موقع پر مختصر انداز میں دی گئی ہے "راہ خدا میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۹۴)

حکومت اسلامیہ کے دفاعی مصارف

اور ذرائع آمدنی

ممکن ہے اس کو درازنفسی سمجھا جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ قرآنِ حکیم نے امت اسلامیہ کے جو فرائض تجویز کیے ہیں مسلمان ان سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ جب پوری دنیا کی قیادت اور بین الاقوامی لیڈرشپ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اسی لئے قرآن حکیم نے صرف اتنی طاقت کو کافی نہیں سمجھا جو ملک کی حفاظت کر سکے، بلکہ حکم یہ ہے:۔

"جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ایسا ساز و سامان مہیا کئے رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور خود اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔"

(سورہ انفال آیت نمبر ۵۹) تمام دنیا کی قیادت مسلمانوں کے لئے اجنبی بات نہیں ہے۔ کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کو یہ منصب حاصل رہا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں مشہور مورخ ابن خلدون نے تنبیہہ کی تھی کہ چنگیز بھی اپنی طاقت بڑھا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے مقابلہ پر آجائیں (مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۵۲ قیادۃ الاساطیل)

بہرحال تمام دنیا کی قیادتِ عامہ سنبھالنے کے لئے جس طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے دولت کہاں سے آئے گی۔؟

کسی خوش فہم کو مطمئن نہ ہونا چاہیئے کہ ترقیاتی منصوبوں یا دفاعی استحکام کے مصارف ملک کے غیر مسلم باشندوں سے وصول کئے جائیں گے۔ قرآن حکیم اس ناانصافی کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآنِ حکیم خصوصیت سے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ہدایت دے رہا ہے:۔

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے

پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا آخرت چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو (اگر ایسا ہی ہے) تو (یاد رکھو) دنیاوی زندگی کی پونجی آخرت کے مقابلہ میں اگر کچھ وجود رکھتی ہے، تو وہ بہت ہی تھوڑا ہے (نفی کے برابر)۔ (اور دیکھو) اگر تم قدم نہیں اٹھاتے تو یاد رکھو وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈال دے گا جو دردناک ہوگا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لاکر کھڑا کر دے گا اور تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اپنا ہی نقصان کرو گے۔ (سورۃ توبہ آیت نمبر ۳۸، ۳۹)

پھر ارشاد ہے: نکل کھڑے ہو (قدم بڑھاؤ) ہلکے ہو یا بوجھل، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم میں سمجھ ہے۔ (سورۃ توبہ آیت ۴۰)

یعنی صرف جانیں قربان کرنا نہیں بلکہ مال قربان کرنا بھی مسلمانوں پر فرض ہے اور ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ عقیدہ رکھے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کیونکہ :۔

" بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں "۔

(سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۱۱)

جب مسلمان کا مال خدا کا مال ہے تو اگر دفاعی اور جنگی استحکام کے لئے پورا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوئی تو مسلمان پر فرض ہوگا کہ پورا مال خرچ کر دے۔ اے پیغمبر! تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے جو افزود ہو۔ (سورۃ بقرہ آیت نمبر ۲۱۸)

اس کی وضاحت یہ ہے :۔

" مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری تجارت جس میں گھاٹا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ اگر یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ راہ نہیں دیتا فاسقوں (نافرمان لوگوں) کو (سورۃ توبہ آیت ۲۳) بہرحال

ایک طرف مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ

جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا اور یاد کرو اللہ کو بہت سا اور توقع رکھو کہ تم کامیاب ہو گے۔ (سورہ جمعہ)

یعنی فریضہ نماز اپنے وقت پر ادا کرو۔ پھر کاروبار میں مصروف ہو کر منافع حاصل کرو دوسری طرف یہ ہدایت ہے کہ جو کچھ منافع حاصل کرو اس کو اللہ کا فضل و انعام سمجھو اور یقین رکھو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ملّت کا ہے اور جب بھی ضرورت پیش آئے اس کو قربان کر دو، تو جس ملّت کا یہ دستورالعمل ہو گا تو کیا کبھی اس کا کوئی منصوبہ کسی دوسرے کا دست نگر رہ سکے گا۔؟

بہرحال مذکورہ بالا آیات نے جس طرح ترقیاتی منصوبوں اور غیر معمولی دفاعی استحکام کی ہدایت کی۔ ساتھ ساتھ ذرائع آمد کی وضاحت بھی کر دی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ تمام مصارف کی فراہمی مسلمانوں کے ذمہ ہے وہ خود اپنی آمدنی سے یہ مصارف فراہم کریں گے۔

قرآن حکیم نے ان مصارف کے بارے میں کوئی مطالبہ کسی غیر مسلم سے نہیں کیا۔ بے شک غیر مسلموں سے جزیہ لیا جائے گا۔ مگر اس کی حیثیت حفاظتی ٹیکس کی ہے اور اس کی مقدار بھی اتنی ہی ہوتی ہے کہ صرف حفاظتی ضرورتوں (مثلاً پولیس) کے لئے کافی ہو سکے۔

اسلامی حکومت اگر صحیح اصول پر کارفرما ہو تو اس کو بجا طور پر فخر کرنے کا حق ہو گا۔ وہ غیر مسلموں کو شہری حقوق مسلمانوں کی برابر بلکہ بعض صورتوں میں مسلمانوں سے زیادہ حقوق دیتی ہے۔ مثلاً مسلمان شراب کا کوئی دھندا نہیں کر سکتا نہ کشید کر سکتا ہے نہ اس کو خرید یا فروخت کر سکتا ہے اسی طرح مسلمان خنزیر اور بعض ائمہ کے نزدیک ہاتھی کی تجارت بھی نہیں کر سکتا۔ مگر غیر مسلموں کو ان کے کاروبار کی اجازت ہوتی ہے۔ ہدایت صرف یہ ہوتی ہے کہ برسرِ عام نہ ہو۔ شہری حقوق میں اس فراخ حوصلگی کے باوجود ان پر نہ دفاعی اور جنگی ذمہ داری ہے نہ ترقیاتی منصوبوں کے مطالبات ان پر لازم ہوتے ہیں۔

البتہ کسی غیر مسلم قوم نے جب مسلمانوں کی قیادت تسلیم کی تھی اس وقت کوئی ایسا معاہدہ کیا

تھا جس کی بناء پر دفاع میں شرکت کی ذمہ داری ان پر لازم آتی ہے تو مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ معاہدہ کی ہر دفعہ کی پوری پوری پابندی کریں۔

واوفوا بالعھد الخ : عہد پورا کرو عہد کے بارے میں تم سے باز پُرس کی جائے گی

(بنی اسرائیل)

خلفاء راشدین کی وصیتیں دنیا کے سامنے موجود ہیں وہ وفات کے وقت بھی تاکید کیا کرتے تھے کہ جن سے معاہدہ ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس پناہ میں کوئی رخنہ نہ آئے۔

--

ادارہ نے گذشتہ ماہ ایسے تمام خریداروں کی خدمت میں جن کا چندہ ختم ہو گیا تھا خطوط بھیج دیئے تھے۔ جن میں انہیں انکی مدت خریداری ختم ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ نیز یہ دریافت کیا گیا تھا کہ آیا وہ آئندہ کے لیے پرچہ اپنے نام جاری رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کافی انتظار کے باوجود ادارہ کو ابھی تک جن حضرات کا جواب موصول نہیں ہوا انکی خدمت میں پرچہ اس امید پر بذریعہ وی۔ پی بھیجا جا رہا ہے کہ وہ اسے وصول فرما کر ممنون و متشکر فرمائیں گے۔ عطاء اللہ خان۔ منیجر ماہنامہ "انوار مدینہ" لاہور

بہترین و بارعایت طباعت کا مرکز

۵۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

اعلان داخلہ

مدرسہ تجوید القرآن رحمانیہ (رجسٹرڈ) خانوخیل علاقہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں درس نظامی کی تمام کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مدرسہ ہذا میں داخلہ ۸ شوال سے ۱۵ شوال تک رہتا ہے۔ اس سال مولانا شرف الدین صاحب فاضل مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی تدریسی فرائض انجام دیں گے۔

(مولانا حافظ محمد زکریا۔ مہتمم مدرسہ ہذا)

گلشنِ جامعہ

جامعہ کے مدرسین اور بعض اراکین و معاونین

محترم محمود احمد عارف کی نظر میں

جامعہ یہ جامعہ ہے قاسمِ علمِ نبی
مہتمم اسکے ہیں حامدؔ صاحبِ نسبت قوی

جن کو نسبت ہے حسینِ مردِ حق آگاہ سے
فیض پہنچا ہے یہاں اس عارفِ باللہ سے

وہ حسین احمد کہ تھے اسلاف کی اک یادگار
گلشنِ دینِ نبی ہیں جن کے دم سے تھی بہار

رہ کے جس نے سرورِ کونین کے زیرِ نگاہ
خدمتِ دینِ رسول اللہ کی شام و پگاہ

وہ امامِ وقت تھے وہ قطبِ دوراں بے مثیل
آیۂ رحمت وہ فیضانِ نبی کی سلسبیل

وہ کہ تھے اربابِ دانش کے امیرِ کارواں
ذات ان کی تھی سراپا عزم و ہمت کا نشاں

وہ مجاہد وہ امیرِ مالٹا کے تھے رفیق
طالبانِ دین پہ ماں باپ سے بڑھ کر شفیق

خُلق میں پرتو تھا اخلاقِ رسول اللہ کا
وہ چہیتا تھا رشیدِ عارفِ باللہ کا

اس کے مُحسن حضرتِ محمود محمودِ زماں
وہ جنیدِ وقت وہ قطبِ زماں فخرِ جہاں

وہ کہ تھے علم و عمل میں آپ ہی اپنی مثال
سامنے جھکتے تھے جسکے آکے سب اہلِ کمال

زیب دیتا تھا انہیں ہی شیخِ عالم کا لقب
ذاتِ ربّی نے بنایا تھا انہیں عالی نسب

وہ کہ تھے سرمایۂ مجد و شرف مردِ جلیل
اہلِ حق کے واسطے ان کا عمل روشن دلیل

جانشین ان کے حسین احمد وہ مردِ خوش خصال
جامعیت میں نظر آتی نہیں ان کی مثال

فیض کا ان کے ہے مظہر جامعہ یہ بالیقیں
اس کی نسبت ہے بنامِ رحمۃ للعالمیں

سرپرستی اس کو حاصل ہے عبید اللہ کی

پیکرِ مہر و وفا ہیں جامعِ صدق و صفا
صاحبِ زہد و ورع ہیں جانِ اربابِ ہدیٰ

مدرسین و منتظمین جامعہ

اہلِ دانش کی نظر میں صاحبِ فضل و کمال ہیں شریف اللہ، کریم اللہ مردِ خوش خصال
وہ ظہورِ حق کے مظہر مفتی عبد الحمید طالبانِ علم کے عقدہ کشا مردِ سعید
پاک طینت ہیں بہت اک مولوی فرقان بھی

تاجِ قرا ہیں مگر ناموں کی نسبت ایک ہے ڈیروی اور تونسوی دونوں کی فطرت نیک ہے
میرزا گُل بھی مثالِ گُل مہکتے ہیں یہاں دلنشیں تفہیم میں ان کا عجب طرزِ بیاں
وہ فنا فی العلم ہیں اہلِ جہاں سے بے خبر غور سے دیکھو تو اک مجذوب آتے ہیں نظر
ہیں ظہور الحق بھی اس میں صاحبِ فضل و کمال گُلستانِ مصطفےٰ کے بُلبلِ شیریں مقال
ہے تقاضا ہو بیاں تعریف غازی شاہ کی عالمِ دینِ نبی توصیف غازی شاہ کی
فضل احمد ہیں وہ قاری صاحبِ خلقِ کریم جامعہ میں اسطرح گلشن میں جیسے ہو شمیم
مولوی عبد الرشید و حافظ عبد الرشید طالبانِ ذاتِ حق ہیں دونوں مردانِ سعید
سیّد انور نفیس باوفا روشن ضمیر حاملِ نسبت بھی ہیں وہ ایک مردِ بے نظیر
قطب عالم کی وہ نسبت کے امینِ خاص ہیں جامعِ صدق و صفا ہیں پیکرِ اخلاص ہیں
مولوی بھی ہیں نذیر اور حافظِ قرآن بھی وہ مدرس بھی کتب خانہ کے ہیں نگران بھی
ایک خادم ہیں غلامِ سرورِ کون و مکاں دوسرے شبیر محمد بھی ہیں اک مردِ جواں
صاحبِ برکات ہیں برکات احمد بھی عجیب

مقامی معاونین کرام

صاحبِ فہم و فراست ہیں غلام دستگیر حضرتِ موسیٰ نے فرمایا جنہیں بدرِ منیر
فطرتًا پاکیزہ سیرت صاحبِ قلبِ سلیم طالبِ حُب و رضائے قادرِ مطلق کریم
حافظ فرقان احمد صاحبِ جود و سخا جامعہ کے واسطے ہیں معدنِ لطف و عطا
ہیں مبین احمد شریف النفس اور مردِ فہیم جن کو بخشا ہے خدائے پاک نے ذوقِ سلیم

ہیں غلامانِ محمدؐ میں وہ حاجی گامؔ بھی — بادۂ توحید سے بھرپور ان کا جام بھی
بھائی اسماعیلؔ و بسا پہلواں بھی خوب ہیں — حلقۂ احباب میں اپنے بہت محبوب ہیں
اس گروہِ خادمانِ دیں میں ہیں عبدالحکیمؔ — حاجیٔ حرمین ہیں وہ طالبِ لطفِ عمیم
افتخار الدّینؔ سیّد صاحبِ عزّ و وقار — جامعہ کے واسطے ہیں مایۂ صد افتخار
وہ امیرِ جامعہ کے اِک رفیقِ کار ہیں — پاک طینت نیک فطرت صاحبِ ایثار ہیں

کراچی شہر کے معاونین کرام

ہیں شریفؔ احمد کریم النّفس مردِ بے نظیر — عالمِ دینِ مبیں ہیں صاحبِ روشن ضمیر
جامعہ کے ساتھ ان کو ہے دِلی وابستگی — شغل ہے تعلیمِ دیں، تعلیم بھی قرآن کی
کیا کہوں میں ان کے اخلاقِ کریمانہ کی بات — دین و دانش سے مزین ذات انکی پُرصفات
ہیں یکے از خادمانِ شیخِ ما حافظؔ سعید — ہیں وہ اصحابِ سخا میں صاحبِ جود سدید
ذکرِ رحمٰنؔ جو کہ ہیں اِک خادمِ دینِ مبیں — ان کا شیوہ اور عادت خدمتِ دینِ متیں
نام کی نسبت سے ہیں منصورؔ منصور زماں — جان و دل سے ہیں فدائے سرورِ کون و مکاںؐ

جامعہ کے شیخ اِک مجموعۂ حسنات ہیں — دیکھ عارفؔ کی نظر سے مخزنِ برکات ہیں
آفتابِ علم و حکمت ہیں وہ عارفِ بالیقیں — باطناً وہ شیخ عالم کی ہیں نسبت کے امیں
ان کی برکت سے یہ مرکز مرکزِ رشد و ہدیٰ — طالبانِ دین و دانش کے لیے ہیں رہنما
ہے عمارت جامعہ کی دلکش و جاذبِ نظر — شاد ہوتے ہیں جسے سب دیکھ کر اہلِ نظر
خاکِ پاکِ پدر سے بنیاد اس کی استوار — مہبطِ انوارِ ذاتِ خالقِ لیل و نہار
دے کے یارب میں محمدؐ مصطفےٰ کا واسطا — مانگتا ہوں ذات سے تیری تہہِ دل سے دُعا

تا قیامت یہ رہے سرچشمۂ فیضِ عُلوم
بارگاہِ قدس میں مقبول ہو دار العُلوم